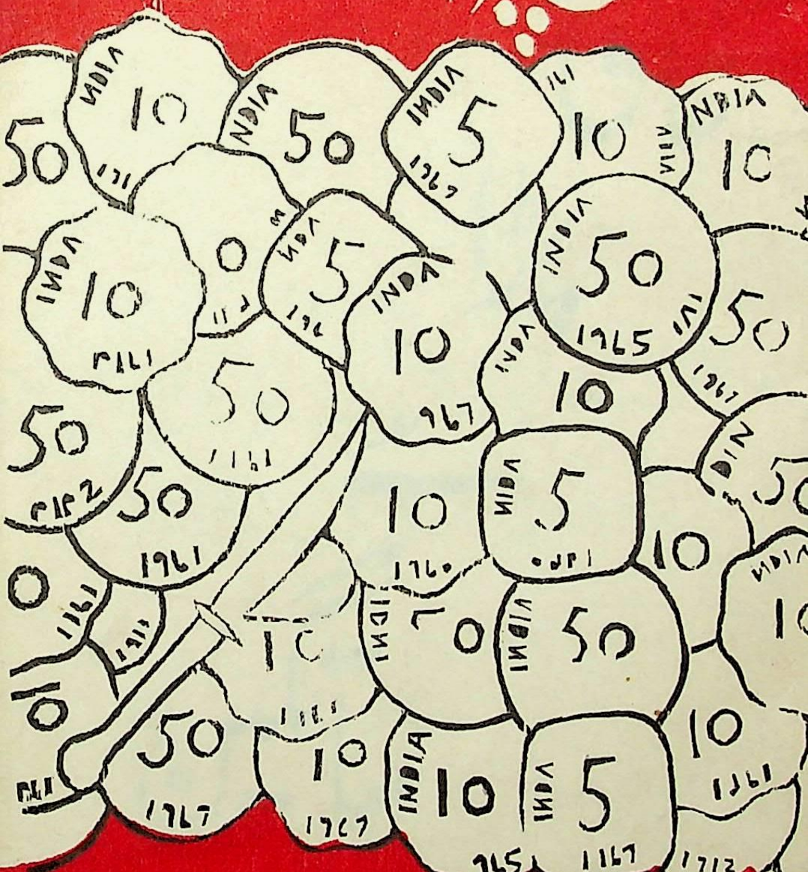
خالی پڑا ہے ساگیں



از رشید پاگل

خالی پڑا ہے آنگن

از

منشی سعید ساحلؔ

قیمت :- ایک روپیہ

خالی پڑا ہے ساتگین پر تشنہ کام ہوں
رسوا تو میں ہوا ہی کوئی دوسرا نہ ہو

امید کشمیری

ترتیب

PRINTED AND PUBLISHED BY
POASH: KARAN NAGAR SRINAGAR
KASHMIR

ان بیشمار دوستوں کے نام
جنہوں نے اپنے خطوط سے
میری ہمت افزائی کی

وحشی سعید ساحلؔ

رنگ بدلتا ہے

اُس کا دعویٰ تھا کہ وہ ادیب ہے۔ وہ ادیب تھا یا نہیں تھا یہ دوسری بات ہے لیکن اُس نے ادیب کا روپ دھارن کیا تھا۔ مثال کے طور پر اُس نے لمبی اور کالی شیروانی پہن رکھی تھی۔ سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ سفید تنگ موری والا پاجامہ اور لمبی شیروانی کے اوپر کی جیب میں دائیں جانب کاغذ کا ایک چھوٹا بنڈل رکھتا تھا۔ راستے میں چلتے ہوئے ہاتھوں کو ایسے ہلاتا تھا جیسے کسی نئے افسانے کو ترتیب دے رہا ہو۔ اس کا یہی انداز

اُسکو دنیا کا سب سے بڑا بیوقوف بناتا تھا۔
بات دراصل یہ تھی کہ جناب ایک پرائمری سکول
میں استاد کا کام انجام دے رہے تھے۔ ان کی عمر
لگ بھگ چالیس سال کے قریب تھی۔ لیکن ابھی تک
کنوارے ہی تھے۔

استاد صاحب نے ادیب بننے سے پہلے
شاعر بننے کے لئے طبع آزمائی کی تھی۔ لیکن اس
میدان میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بات دراصل یہ تھی کہ شعر
کا وزن درست کرتے کرتے وہ خود بے وزن ہو گئے
اس لئے اس میدان میں چاروں شانے چت گر پڑے
یہاں سے رخصت حاصل کر کے اُس نے موسیقی کے
کے میدان میں طبع آزمائی کی۔ لیکن قسمت نے یہاں
پر بھی ساتھ نہ دیا۔ کیونکہ نئے نئے تال انہیں سمجھ لگاتے
ہوئے وہ خود بے سرا ہو گیا ہارمونیم میں ادھر لہر کا آغاز کرتے
ہوئے اُس کی گمان نے جواب دیا۔ اس لئے استاد
صاحب تان سین بننے سے محروم رہے۔ اب جناب ادب
کے متوالے افسانہ نویس بن گئے۔ شادی تو اُس کی
ہو نہ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ ذیابیطس کے مریض تھے۔
عشق نے ہی اُس کو شاعر بننے کے لئے مجبور کیا

تھا۔ کیونکہ جس لڑکی کے ساتھ اُس نے پیار کیا تھا
وہ نوابی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ جہاں بات
بات پہ شعر کہے جاتے تھے۔ جہاں کھانے پینے کے
برتنوں میں شعروں کا ہونا ضروری تھا۔ شعر کے بغیر
کھانے کا ایک لقمہ حلق سے نیچے نہیں جا سکتا تھا۔
اس لئے اُستاد صاحب نے شاعر بننے کے لئے
ریاض شروع کیا تھا۔ لیکن شکایت وہاں کی ہی
رہی۔ جس طرح وہ شاعر بننے سے محروم رہا۔ اسی
طرح وہ لڑکی کو سمجھنے سے بھی محروم رہا۔ آخر ایک
دن لڑکی نے ساتھ چھوڑ دیا۔

اس کے بعد دوسری لڑکی کے ساتھ اُس نے
پیار کیا۔ اس کا خاندان تان سین سے جا ملتا تھا۔
اس لئے سنگیت کار ہونا ضروری تھا۔ اب اُستاد نے
سنگیت کے میدان میں قدم رکھا۔ اور بہت چیر
پھاڑ شروع کر دی۔ لیکن بدقسمتی یہاں بھی رنگ
لائی۔ لڑکی نے پھر بھی شادی کی پیشکش رکھی
لیکن وہ مرض کے شکار تھے۔ اس لئے اُس نے لڑکی
سے قطع تعلق پر ہی صبر کیا۔

بہت عرصے کے بعد اب ایک اور لڑکی ملی۔

اس لڑکی کی عمر پچیس تیس کے لگ بھگ تھی۔ اور مقامی سکول میں استانی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو ادب کا بیکراں سمندر سمجھتی تھی۔ اور اسی سے لئے اس کا دعویٰ تھا کہ کسی ادیب کے ساتھ شادی کرے گی۔ اب تک وہ کنواری ہی تھی۔ اتفاق سے ہمارے استاد صاحب جو نرے مولا سے ٹکرائی۔ استاد صاحب نے اس نادر موقع کو غنیمت سمجھا اور ادیب کا روپ دھر لیا۔

آج کل ان کے ہاتھ میں ایک کتاب نظر آ رہی تھی۔ جسکے ٹائیٹل پر موٹے الفاظ میں لکھا تھا۔ "افسانہ کیسے لکھا جاتا ہے۔" استاد صاحب بڑے شوق سے اس کتاب کو پڑھتے تھے۔ لیکن استاد صاحب کے پلے کچھ نہ پڑتا تھا۔ اس لئے اس کتاب کے ساتھ مغزماری کرنے کے بعد کورے کے کورے رہے۔

ہماری استانی صاحبہ نے ہمارے استاد صاحب کا امتحان لیا۔ لیکن استاد صاحب کو یہ میدان کبھی راس نہ آیا۔ کیونکہ استانی صاحبہ کا ہاتھ تلوار بن

کر آسمان پر لہرایا اور بجلی بن کر نیچے گرا۔

استاد صاحب اپنی جان بچاتے ہوئے گلی کوچوں میں بھاگے اور اس انجمن کو خیرباد کہا۔

پھر ایک دن استاد صاحب سنگترے کی ایک چھوٹی دکان پر دیکھے گئے۔ ان کے اس نئے انداز پر میں قدرے حیران رہ گیا۔ میں بیٹھے لڑکھڑاتا ہوا خراماں خراماں استاد کے پاس پہونچ گیا۔ میں نے کہا۔

”استاد یہ نیا دھندا......؟“

استاد نے میری بات بیچ میں کاٹ دی اور کچھ معذرانہ انداز میں کہا۔

”حضرت اس عشق کے مرض نے ہمیں کیا سے کیا بنا دیا۔ گھربار اجڑ گیا۔ نوکری ختم ہو گئی۔ دوست احباب کنارہ کش ہوئے۔ بزرگ نالاں ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے۔“

میں نے سوال کیا۔

”تو کیا کسی میوہ مرچنٹ کی لڑکی سے پیار شروع کیا ہے۔“

”حضرت یہ دل کمبخت جس پر آگیا۔ پھر ذات پات

رنگ و روپ کے قید و بند سے آزاد ہو کر اُسی کے گیت گانے لگتا ہے۔" اب وہ سنجیدہ ہو کر بولا "چنے اُس نے چنے کے کچھ دانے ہاتھ میں سے لے اور لے آگے کہا۔" یہ انسان بھی کیا ہے۔ ایک غلطی چھپانے کے لئے کتنے رنگ بدلتا ہے۔" اُستاد کی شوخی رخصت ہوئی۔ اس کا سر جھک گیا۔ اور اس کے ہاتھ سے چنے کے دانے نکل کر سڑک پر بکھر گئے۔ ان بکھرتے ہوئے دانوں سے ترنم سے شور ہو رہے تھے۔ کسی سے افسانے کے اپنے دھم اور کسی سے سنگریزے بھینچنے کی آوازیں آرہی تھی۔

آخر یہ سب ایک گندی نالی میں دفن ہو کر رہ گئے۔

دھن تردے

آج وہ پھر رات کے بارہ بجے آیا۔ یہ ہوٹل کا کاروبار ہی ایسا ہے۔ کہ جب تک آدمی بیٹھا رہے گا۔ بیٹھا ہی رہتا ہے۔ بیوی اور بیٹی اس کا انتظار کرتے تھے۔ ایک بار رام سنگھ اپنے آپ سے سوچنے لگا کہ کیوں وہ دولت کمانے کے لئے راتوں کی نیند خراب کرے۔ لیکن اس کو ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ دولت کے بغیر یہ عیش و آسائش کیسے میسر ہوں گے۔

دولت سے ہی ایک ایسی پیاری چیز جو آدمی چھوڑنے کے بعد بھی چھوڑ نہیں سکتا۔ آدمی اس کے پیچھے دوڑتا ہے تب ہی چھوڑ دیتا ہے۔ جب وہ موت کی

آغوش میں چلا جاتا ہے

رام سنگھ چار گھنٹے کی نیند کے بعد پھر اٹھے گا اور دولت کے چرخے کو گھمائے گا۔ دنیا کی ریت ہی ایسی ہے۔ اس میں رام سنگھ کا قصور نہیں ہے۔

رام سنگھ صبح سویرے اٹھا اور غسل خانے میں داخل ہوا۔ اچانک اس کے کانوں میں آواز پڑی۔

"ہے بھگوان ہمیں دھن نہ دے!"

یہ تو اس کی بیوی کی آواز تھی۔ وہ تذبذب کے عالم میں پڑا۔ اس کے دماغ میں خیال آیا کہ اس کی بیوی پاگل ہو گئی ہے۔ اور وہ پریشان ہوا وہ سوچنے لگا۔

"اب کیا ہوگا؟"

اس کے دماغ میں "اب" سوال بن کے رہ گیا رام سنگھ یہ سوچ کے برف کی سل کی طرح پگھل رہا تھا۔ کہ اس کی بیوی پاگل ہو گئی ہے۔ جب وہ پوجا کے کمرے سے آئی تو اس کے سب حرکات و سکنات معمول کے انسان کی طرح تھے۔ اور رام سنگھ اپنے ساتھ سوچنے لگا۔

"شاید میری بیوی کو پاگل پن کا دورہ بھگوان کے کمرے میں پڑتا ہے۔"

لیکن رام سنگھ اس معاملے کی پوری کھوج کرنا چاہتا تھا۔ اور من ہی من میں یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ وہ کسی ڈاکٹر کے پاس اپنی بیوی کو لے جائے گا۔

دوسرے دن صبح رام سنگھ تعاقب میں رہا کہ کب اس کی بیوی پوجا پاٹھ کے کمرے میں جاتی ہے رام سنگھ نے اپنے کان دروازے کے ساتھ لگا دیئے۔

"اے بھگوان ہمیں دھن نہ دے"۔

پھر وہی آواز اب رام سنگھ کو یقین ہو گیا کہ اس کی بیوی پاگل ہو گئی ہے۔ لیکن جب اس کی بیوی کمرے سے باہر آئی۔ وہ بالکل ٹھیک تھی۔ رام سنگھ نے اپنی بیوی سے کہا۔

"شاید بھگوان کے کمرے میں تمہیں پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے"

"نہیں تو"!

رام سنگھ نے کہا"۔ پھر تم بھگوان سے یہ کیوں کہہ رہی تھیں کہ اے بھگوان ہمیں دھن نہ دے"۔

اُس کی بیوی نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

"میں بھگوان سے اس لئے کہہ رہی تھی کہ پہلیں دھن نہ دے تاکہ اگر وہ زیادہ دھن دے گا۔ تب آپ بارہ بجے کے بجائے رات بھر گھر سے غائب رہیں گے۔"

رام سنگھ بیوی کی طرف دیکھ نہ سکا۔ اس کا سر نیچے جھک گیا۔ کیونکہ وہ دولت کے ساتھ یہ بھول گیا تھا۔ کہ اُس کی ایک بیوی اور ایک بیٹیا بھی تھی۔

رشتۂ تصویر

حیرت سے بار بار میں اس تصویر کو تکتا رہا۔ دہلی میں تصویروں کی نمائش میں جس تصویر نے مجھے بہت متاثر کیا، وہ یہی تصویر تھی۔ جس کو صرف پیار سے ہونے کے لحاظ سے رکھا گیا تھا۔

ایک دوشیزہ کی تصویر جو مچھیرن کے لباس میں دریا کے کنارے کھڑی تھی۔ لیکن مصور نے اس کی آنکھ میں معصومیت کا وہ رنگ بھر دیا ہے۔ کہ انسان اس کو دیکھتا ہی رہتا ہے۔ دوشیزہ مچھیرن کی نئی تصویر ہو بہو اس کی پرانی تصویر کی نقل تھی۔ جو میں نے کچھ دن پہلے مصور کی تصویروں کی نمائش میں دیکھی تھی۔ اب بھی مجھے یاد آتا ہے کہ میں دوشیزہ کی آنکھوں کی معصومیت میں اس قدر کھو گیا تھا کہ میں نے محسوس کیا تھا کہ میرا شعور

سو گیا ہے۔ اور پھر جب میں نمائش سے باہر آرہا تھا کہ ایک حادثے سے دوچار ہوا۔ جی ہاں! میرے لئے وہ پتے پتے ایک دماغی حادثہ تھا۔ اور میں سوچنے لگا کہ کہیں تصویر کی لڑکی کی تصویر میرے تحت الشعور میں تو چلی نہیں گئی جو خواب میں ایک انسان کی طرح ایک جیتی جاگتی۔ وہی بن گئی۔ نہیں خواب وہ لڑکی سچ مچ ایک حقیقت بن گئی۔ وہ خواب نہیں تھا [illegible] کے [illegible] سکتہ طاری تھا لیکن لڑکی کی آواز [illegible] نے جگا دیا۔

"آپ اس پرانی تصویر کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔"

"جی ہاں" میں نے کھوئی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"لیکن یہ تو تمہاری تصویر ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر پرانی ۔ ۔ ۔ ۔"

"آہ" حسین لڑکی نے کہا۔ "اس تصویر کے ساتھ ایک کہانی وابستہ ہے۔ ایک پرانی کہانی۔ اتنی ہی پرانی جتنی یہ تصویر۔"

"میں وہ کہانی جاننا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟" اس نے میرے سامنے سوال رکھا۔

میں اپنے آپ کو مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا ہوں اور میں ایک ادیب ہوں جو ہر لمحہ نئی کہانی کی تلاش میں

سرگرداں رہتا ہے۔"

پھر اُس نے اپنی سریلی آواز میں کہا۔

"آؤ میرے ساتھ۔"

ہم دونوں نمائش سے باہر آئے سڑک کے کنارے ایک چھوٹی گاڑی کھڑی تھی۔ اُس نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ اور میں گاڑی میں سوار ہوا۔ وہ گاڑی چلانے لگی۔

بیس منٹ بعد ہماری گاڑی ایک کھنڈر کے سامنے رک گئی۔ میں حیران ہوا۔ میں نے معلوم کرتے ہوئے کہا۔

"کھنڈر"

"جی ہاں کھنڈر" اُس لڑکی نے کہا۔"جانتے ہیں آپ اس کھنڈر کے ساتھ میری کہانی وابستہ ہے۔ ان دنوں میں سیٹھ رام پرشاد کی بیٹی نہیں تھی۔ جس کا ایک بیٹا آج لندن میں پڑھ رہا ہے۔ اُس کی بیٹی فیئٹ کار میں بلیسور کی صاف و شفاف سڑکوں پر گھومتی ہے۔ میں ایک معمولی مچھیرے کی بیٹی تھی۔ آؤ میرے ساتھ میں تم کو کھنڈر کے ہر ایک حصے سے جانکاری کراؤنگی۔"

مجھے ڈر سا محسوس ہوا ایسا معلوم ہوا کہ میرے سامنے ایک روح کھڑی بول رہی ہے۔ اور میں اُس کے اشاروں پر ناچ رہا ہوں۔ لیکن اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے میں اندر داخل ہوا

ہم ایک وسیع کمرے میں پہونچ گئے۔ ایک گری ہوئی دیوار پر بوسیدہ تصویر نظر آرہی تھی۔ اس پر ایک نوجوان گھوڑے پر سوار نظر آرہا تھا۔ لڑکی نے کہا۔

"میں بینا کشی اور یہ کمار" مجھے محسوس ہوا یہ ساکت کھڑی روح میرے سامنے مدہوشی کے عالم میں بھیگی اور رعب دار آواز میں کہہ رہی ہے۔

"وہ معصوم فضائیں" اور چہکتے ہوئے پرندے ملہاریں گاتی ہوئی قمریاں، نالے لگاتی ہوئی بلبلیں پانی کی مچلتی لہروں میں مچھیروں کی روزی کی تلاش۔ اور ان کی سادہ زندگی۔

مچھیروں کی اسی لبتی میں میں نے پہلی بار جنم لیا۔ جب میں عمر شباب پر پہونچی تو نسیم اور باد صبا کے جھونکوں نے میری زلفوں سے اٹکھیلیاں شروع کر دیں۔ اسی دوران دیوان سربندر کی للچائی ہوئی نگاہوں نے میرا تعاقب شروع کیا لیکن میری روح اس ذلیل انسان پر تھوکتی رہی میں انہیں کو دیکھ کر حقارت سے منہ پھیر لیتی میں اپنے محبوب کی تلاش میں تھی اور دریا کے کنارے بیٹھ کر اس کے انتظار میں بیچین رہتی۔ ایک دن وہ آیا۔۔۔ ہاں ایک دن۔۔۔ آیا۔ میرے بکھرے خوابوں کا شہزادہ اپنے ساتھ بہاروں اور امنگوں کے طوفان لے کر۔ مجھے ہر سو پھولوں کی مہک اور حیا شدنی نظر آنے لگی۔

آواز میرے کانوں میں رس گھولتی۔ اور میٹھی لوری سنا کر مجھے میٹھی نیند سلاتا تھا۔ وہ مصور تھا۔ میرے حسن کا۔۔۔ میں گھنٹوں پتھر کی مورتی بنی رہتی اور وہ میری تصویر بنانے میں محو رہتا۔ میں اس میں ایک روح دو قالب بن کر سمو جاتی۔"

پھر اُس کی آواز میں قدرے جوش آگیا "لیکن زمانے کی نظروں میں ہمارا پیار پاپ بن کر کھٹکنے لگا۔ زمانہ دشمن ہوا۔ کیونکہ میرے من کا دیوتا۔ جاگیردار کا لڑکا تھا اور میں ایک اچھوت کی لڑکی۔ زمانہ کیونکر یہ برداشت کرتا۔ پھر ایک دن دیوان میری عصمت کو کھلونا سمجھ کر کھیلنے آیا۔ لیکن میری روح جس طرح کمار سے وابستہ ہو گئی تھی اسی طرح میرا جسم بھی کمار کے لئے تھا۔ گناہوں کا یہ شیطانی سایہ میرا پیچھا اپنی پوری ہوس سے کر رہا تھا۔ اس کشمکش میں میں ایک چٹان سے گر پڑی اور اس دنیا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی۔ لیکن روح کا واسطہ کمار کے ساتھ تھا اس لئے اس کے پاس آتی رہی کمار اس صدمے کو برداشت نہ کر سکا اُس کی روح بھی قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

آخرکار مجھے دوبارہ جنم ملا اور ایک امیر خاندان میں پیدا ہوئی مجھے اپنے بھائی سے بے حد انسیت ہے ہم دونوں نے ایک ہی ساتھ جنم لیا ہے۔ جب وہ چھ سال کا ہوا ڈیڈی نے اسکو لندن

بھیجدیا۔ اب وہ بارہ سال کے بعد واپس آرہا ہے۔ اس کو اپنی ساری کہانی سنادوں گی۔ وہ ضرور میرے گمشدہ محبوب کی تلاش کرے گا۔ بارہ سال بیت گئے اب میں اُس کو دہلی سے جارہی ہوں وہ چند دنوں میں آئے گا۔" میں نے مینا کشی سے سوال کیا۔

"لیکن تمہیں کس طرح اپنا پہلا جنم یاد آیا؟"

"مجھے ایک دن کالج کی لڑکیوں کے ساتھ پکنک جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ وہی جگہ تھی۔ اس کھنڈر کو دیکھ کر مجھ پر جنون طاری ہوا اور آہستہ آہستہ مجھے اپنی کھوئی ہوئی یادداشت واپس آئی۔"

"مگر وہ تصویر آپ کو کہاں سے ملی جسکو آپ نے نمائش میں رکھا ہے؟"

"وہ تصویر مجھے اس کھنڈر میں ملی تھی۔ میں نے اس کو خرید لیا، پھر نمائش میں رکھا۔ سوچا جب کمار اس تصویر کو نمائش میں دیکھے گا۔ وہ تڑپ کر میری تلاش کرے گا۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ اُس نے پھر جنم لیا ہے۔"

اُس نے اعتماد بھری آواز میں کہا۔

"جس طرح مجھے اپنے وجود پر یقین ہے۔ اسی طرح مجھے اس کے دوبارہ جنم لینے پر یقین ہے۔"

دہلی کی تصویروں کی نمائش میں دوبارہ اس لڑکی کی تصویر دیکھ کر مجھے اس کے آخری الفاظ یاد آ گئے۔ جس مصور نے یہ تصویر بنائی۔ میرے دل میں اس سے ملنے کے لئے ایک کسک پیدا ہو گئی۔ میں نے اس تصویر کے مصور کو تلاش کیا اور دہلی کے ایک بڑے ہوٹل میں ملنے گیا۔ ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی میرے منہ سے دبی چیخ نکلی۔

"کمار"

وہی ناک نقشہ وہی شباہت ہو بہو اس کی شکل کھنڈر والی تصویر سے ملتی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میرا نام رشی ہے۔"

"جی۔ ۔ ۔ وہ۔ ۔ ۔ ہاں میں نے آپکی تصویر نمائش میں دیکھی دل میں آپکے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ بہت پیاری تصویر ہے۔"

"شکریہ جناب"

"کیا آپ یہ بتانا گوارا کریں گے کہ آپ نے تصویر میں دوشیزہ کو مچھیرن کا لباس کیوں پہنایا ہے۔"

"پتہ نہیں! میں اب بھی حیران ہوں۔ برسوں سے میرے خیالوں میں یہی صورت مسلط تھی۔ میں نے اس کو کاغذ پر عملی جامہ پہنا دیا۔ لیکن اب مجھے یہ شدت سے محسوس ہو رہا ہے۔ کہ اس کے ساتھ میرا گہرا رشتہ رہا ہے شاید پچھلے جنم میں۔

ہم ایک دوسرے کے دوست یا رشتہ دار ہوں"۔

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میناکشی کمرے میں داخل ہوئی اور خوشی میں چیخ کر دوڑتی ہوئی رمیش کے گلے سے لگ گئی۔

"رمیش تم آ گئے۔ بہت ستایا تم نے"۔

"بینا آج مجھے پورا یقین ہوا ہے کہ میں نے خواب دیکھا نہیں تھا۔ وہ ایک حقیقت پر مبنی دلخراش داستان تھی۔ میں جاگیردار کا بیٹا اور تم مچھیرن کی بیٹی۔ لیکن اب دنیا کا کوئی بھی طلسم ہم کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتا ہے"۔

میں یہ سب تماشہ خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ دو برس سے بھٹکتی ہوئی روحیں ایک دوسرے کو دیوانہ وار چوم رہی تھیں۔ یہ دیکھ دیکھ کر میں بھی انجانی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی انگریزی لباس میں ملبوس داخل ہوا۔ اس نے کہا۔

"رمیش مل پائے اپنی بہن سے ......"

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے ...... بہن کا رشتہ ان دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے گلے میں حمائل تھے۔ کھل پڑے ...... ایک خلا ...... ایک دیوار بن رہی تھی دونوں کے درمیان، میں سوچتا رہا ......

جرم

وہ لہراتا اور بل کھاتا لچکدار جسم والے لمبے لمبے گیسو پھر اسیر قیامت، آنکھوں میں کاجل کے تیر حسین چہرے کو ادا سے چھپانا۔ صراحی دار گردن کے خم ہونٹوں پر کوندتی بجلیاں اور..... اور.....

رقص پورے عروج پر تھا۔ گھنگروں کی چھن چھن سے فضا لرز رہی تھی۔ حسن سے چور چور ہو کر جوانی ناچ رہی تھی۔ ہیر بالوں کی اس بستی میں میں مہمان بن کر آیا تھا۔ شادی کی اس تقریب کو ماحول جشن میں بدلنے کا اس سے زیادہ اچھا طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ..... عورت ناچ رہی تھی اس کا ننگا پیٹ ربڑ کی طرح کبھی سمٹ جاتا اور کبھی مڑ وہ جاتا، شراب میں بدمست آدمی اس کے ہاتھ اور ..... کو چوم رہے تھے۔ وہ اس کے ایک ایک حصے کو چھو لینے چاٹنے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے۔

اس رنگین اور بدمست ماحول میں ایک دلخراش چیخ فضا کے پردوں کو چیرتی ہوئی آکاش و زمین کے دبیز پردوں میں ڈوب گئی۔ مگر ایسی چیخیں بدمستوں کی محفل میں نقار خانے میں طوطی کی آواز ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک معصوم بچّی کی

چیخ ، جوان امنگوں کی چیخ یہ رقاصہ کی بچی تھی ۔ لیکن رقاصہ کے دلفریب ناچ اور جسم کو کھڑکھڑاتے ہوئے نوٹ اور زرق برق سکے مل رہے تھے ۔ وہ روپوں کے اس انبار کو سنبھالے یا بچی کو ۔ دھن کی دیوی کو حاصل کرنے والی یہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رقاصہ چیخ پڑی ۔

" روک دو اس بچی کو ۔ میرے جسم کو ! میرے ناچ کو ! میرے نخروں کو ! ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے روپے مل رہے ہیں دھن جو زندگی کی سب سے بڑی شے ہے ۔ "

چیخ دبا گئی ۔ یہ چیخ کیسے اور کیونکر دب گئی ۔ میرے لئے یہ سوال بن گیا ۔ زندگی کو کیسے بیجان بنا دیا گیا ۔ اس ممتا بھری چیخ کا کیسے گلا گھونٹ دیا گیا ۔ میرا ذہن اس مسئلے کی پیچیدگیوں میں الجھ گیا اور خود کو یہ سمجھا کر دھوکہ دیا ۔

" شاید بچی خود سو گئی ۔ "

پھر رقاصہ کا انداز بدلا نئی طرز سے بازوؤں اور ٹانگوں کو تھرکانا شروع کیا ۔ سرخ شراب اس محفل کی رونق تھی ۔ اور رقاصہ کی دلفریب آواز نغمے کو رنگین بنا رہی تھی ۔

لیکن پھر وہی چیخ ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہی ننھی ننھی چیخ !! چیخ نکلنے سے پہلے دبا دی گئی ۔ میں اس بار استاد کے قریب تھا میں نے رقاصہ کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی شیشی دیکھی ۔ بچی

کے منہ میں دو قطرے ٹپکا دیئے گئے۔ میں نے ایک استاد سے پوچھا۔

"یہ شیشی!؟"

اُس نے دبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"افیون"

میرے بدن میں گرمی کی لہر دوڑ گئی اور اپنے آپ کو جھکڑا تا ہوا محسوس کرنے لگا۔ ایک ننھی جان کے خون میں ابھی سے افیون کے ذرات ملائے جاتے ہیں۔ اس سے بڑا جرم اور کیا ہو سکتا ہے مجھے محسوس ہوا کہ رقاصہ میرے لئے ناچ رہی تھی۔ وہ اس معصوم بچی کے خون میں گندگی کے جراثیم بھر رہی تھی۔ زندگی اس قدر سیاہ ہو سکتی ہے۔ میں نے اس کا تصور کبھی نہیں کیا تھا۔ میں اندھیرے میں وہاں سے بھاگ پڑا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ اس بچی کے قہقہے میرا پیچھا کر رہے ہیں۔

اوں

"نہ"

"کیوں"

"نہیں"

"دیکھو"

لب سے لب پیوست ہوئے ازدواجی زندگی کے یہ رنگین دن۔ شوخ مسکراہٹ، رنگین نخرے گرم بوسے یہ ہے جوان جوڑے کی نئی زندگی۔ پھر اسی میں آواز آئی۔

"اوں... آ... اوں"

لب سے لب جدا ہوئے۔ جوشیلے جذبات سرد ہوئے زندگی کی تیز رفتار مدھم ہوئی۔

"اوں"

"منا"

ماں کی آواز آئی۔ وہ اٹھتی ہے۔ شوہر نے بازو پکڑا اس نے احتجاج کیا۔

"کہاں"

"منا"

"اور ہم"

"منا"

پھر ... سننے کی آواز آئی۔

"اوں ... آ ..... اوں"

"یہ بھی آگیا" عاجز ہوتے ہوئے شوہر نے کہا۔ "میرے شوق کا خون کرنے کے لئے"

اُس کی بیوی ہنستی ہوئی جاتی ہے۔ وہ سرد آہ بھرتا ہے پھر رات کی ریشمی زلفوں نے ان دو لوں کو اپنی آغوش میں لیا۔ ملی جلی آوازیں آتی ہیں۔

"اوں"

"آئی"

"آ"

"او"

جذبات بھرے دلوں کی دھڑکنیں اندھیرے میں ترنم پیدا کرتی ہیں۔ پھر ایسے میں ایک چیخ آتی ہے۔

"آ ... آ .... آ ... اوں"

لیکن یہ آواز دو جوان دلوں کے جذبات کو کچل ڈالتی ہے۔ دو جوان چہرے پھول گئے، تیور چڑھ گئے۔ پھر بھی ماں کی آواز آتی ہے۔

"منا"

شوہر کو غصہ آتا ہے۔

"جانے دو"

"لیکن"

جذبات سرد ہوئے۔ لیکن غصے سے جوان چہرے سرخ ہو گئے۔

"کیا؟ ... جاؤں ..."

"جاؤ ... اب کیا؟ ..."

دوسرے دن جب چائے پر شوہر آتا ہے اس کی ناراضگی اب بھی بحال تھی۔ بیوی نے ناراضگی محسوس کی اور اس نے کہا

"آپ ... ناراض"

"ناراض کیونکر" شوہر کہتا ہے۔ "آخر اس بچے نے ہماری زندگی اجیرن بنا دی اب کیا ہوگا؟"

لیکن کیا کبھی یہ شوہر بچہ نہ تھا۔ کیا کبھی یہ نہ رو پڑتا تھا؟

"حل ہے" بیوی نے جواب دیا۔ کیا کبھی اس کی بیوی بچی نہیں تھی۔ کیا کبھی کسی ماں نے اس کے لئے اپنی جوان نیند اور جوان عیش حرام نہ کر دیئے۔ شوہر نے کہا۔

"جلدی کہو"

"ایک حل ہے۔ میں بچے کو اپنی ماں کے پاس بھیجتی ہوں وہ پوتے کو بہت چاہتی ہے"

"بہت اچھا۔ آ۔ کل سے مزہ آئیگا"
شوہر خوش ہوکر جواب دیتا۔ بوڑھے "ادل" کیلئے ہوتے ہیں اور جوان "آ" کے لئے ہوتے ہیں۔

رونا غریب

سنا تھا بڑے دن اپنے ساتھ بہت کچھ لاتے ہیں لیکن غریبوں کے لئے مشکلات کا پہاڑ کھڑا کرتے ہیں۔ یوں تو غریب مشکل اور مجبوری کا مرکب پیدا ہی ہوا ہے۔

ایک غریب کا بھی ایک چھوٹا سا خاندان تھا۔ ایک بیوی دو بچے۔ ایک باپ۔ بیوی کے لئے ایک ساڑھی دو بچوں کے لئے قمیض و نیکر کا ایک ایک سوٹ۔ باپ کے لئے نوابی طرز کی ٹوپی۔ لیکن ان سب چیزوں کو خریدنے کے لئے سو روپے درکار تھے۔ لیکن صاحب غریب کو گورنمنٹ کے آفس سے چالیس روپے ملنے والے تھے۔ پورے دو گھنٹے قطار میں کھڑے ہوتے ہو گئے تھے۔ دس بیس روپے میں گوشت سگریٹ وغیرہ تو لانا ہی پڑے گا۔ پھر بیس روپے

اور سو روپے میں بہت بڑا خلا نظر آرہا تھا۔

زندگی کی اس الجھن میں وہ اسقدر کھو گیا تھا کہ آس پاس کے ماحول سے بے نیاز ہو کر اپنے مسئلوں میں کھو گیا اچانک ایک چہرے پر اس کی نظر پڑی جانا پہچانا چہرہ وہ بھی قطار میں کھڑا تھا۔ نفیس سوٹ میں ملبوس یہ آدمی اس کو ماضی کے واقعہ کی یاد دلانے پر مجبور کر رہا تھا۔

ہاں اسے یاد آرہا تھا یہ اسی کے محلے کا ایک آدمی ہے۔ یہ شریفوں کے لباس میں غنڈا یہاں کیا کرتا ہے۔ یہ خالص ٹھرا پینے والا شراب خور یہاں کیا کرتا ہے؟

دنیا نبرد کی آگ سے جلے لیکن اس غنڈے کو اس کی فکر رہتی ہے۔ کہ اس کو ٹھرا اور کباب ہر روز ملے۔ اس کیلئے اس کو کچھ بھی کرنا پڑے کسی کا بھی گلا کاٹنا پڑے یا کسی کی جیب کاٹنی پڑے۔

غریب کو یاد آیا کہ غنڈہ کسی کو شام کے اندھیرے میں پاکر اکیلے میں چھری کے خوف سے اس کی جیب کو صاف کرتا تھا۔ یہ اس کا پیشہ تھا۔ وہ الف سے ب تک غنڈہ تھا۔ سماج کے لئے ناسور تھا۔ لوگوں کی زندگی کو اجیرن بنانا اور پھر ہر شام کو ٹھرا پی کے گالیاں بکنا اس کا کام تھا۔ آج اس آدمی کو ایک فسٹ کلاس سوٹ میں ملبوس

دیکھ کر غریب کو حسرت ہوئی کہ اُس کو بھی ایسا ہی سوٹ مہیا ہوتا۔ وہ بے چارا بی اے کی سند حاصل کر کے ایک مقامی سکول میں معمولی استاد تھا۔ جس کی تنخواہ صرف ایک سو روپے تھی۔ زندگی کے بارہ سال اس طرح ضائع کرنے کے بعد اُس کو ایک سو روپے کی نوکری ملی۔

ماں باپ کی امیدیں لوٹ گئیں۔ بیوی بچوں کے تقاضے وہ پورے نہیں کر سکتا تھا۔ اور ایک اچھا سوٹ اُس کو دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ بہتر تو یہی غنڈا وہی سماج کا ناسور جس کو ایک فسٹ کلاس سوٹ مہیا تھا۔ جس کے پاؤں میں چمکتا ہوا بیش قیمت جوتا تھا۔ ٹائی میں سونے کا کلپ لگا ہوا تھا۔ اس کے جوتے کی چمک میں اس کو اپنے بی، اے کی ڈگری ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ خزانچی کی آواز سے اُس کے خیالات منتشر ہوتے۔

"آپ کے پاس کپڑا ۔ ۔ ۔ ۔"

خزانچی نے نہایت نرمی سے غنڈے سے کہا۔ غنڈے نے شاہ نوس کی چادر پھیلا دی۔ پھر کڑکڑاتے نوٹوں کی گڈیاں اس پر گرنے لگیں۔

غریب کو یاد آیا کہ غنڈے نے غنڈا گردی سے سرکار سے پل بنانے کے ٹھیکے حاصل کئے تھے۔

شاہ توس کی چادریں غنڈے نے ایک لاکھ روپے کی رقم سمیٹ لی۔ ایک بوری کی طرح اُس نے ایک لاکھ روپے لٹکا لئے۔

غریب بی۔اے کی سند ہیں کھو گیا۔ اور کبھی سو روپے کی تنخواہ کے چکر ہیں!! پھر خزانچی نے اُس کے خیالات کو پارہ پارہ کیا۔

"چالیس روپے"

صرف چار کاغذ کے ٹکڑے اُس کے بی۔اے کی قیمت تھی۔ اس کی شرافت اس کی عزت کی قیمت تھی۔ اور غنڈے کے فن کی قیمت ایک لاکھ روپے وہ اپنے آپ کو خلا میں بھٹکتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ جس کے وجود کی کوئی قدر نہیں تھی۔

کھو گیا

یہ سڑک ہے۔ پتھر، ریت اور تارکول کی بنی ہوئی۔ یہ مکان ہے۔ پتھر اینٹ ریت اور لوہے سے بنایا گیا۔ یہ انسان ہے۔ گوشت اور ہڈیوں سے بنایا گیا۔ اور وہ قبرستان ہے

یہ انسانوں کی لاشوں سے بن گیا ہے۔ ان میں کوئی بیمار تھا کوئی بہت بڑا تاجر تھا۔ اور کوئی آفیسر اور مزدور۔ فی الحال سب کی لاشیں زمین کے اندر پڑی ہوئی ہیں۔ آج وہ سب لوگ خاموش ہیں جو کل تک بولتے چلتے تھے۔ جو کل تک ہر خواب میں ایک نئی دنیا کو جنم دیتے تھے۔ آج وہ سب لوگ زمین کے اندر بے حس پڑے ہیں۔ نہ جانے کیسی کیسی صورتیں اور سیرتیں اس خاک میں پنہاں ہوں گی۔

غرض یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا ہے۔ اور چلتا رہے گا۔ ہر سال کتنے آتے ہوں گے۔ قبرستان میں داخل ہوکر زندہ انسان کا سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔ خوف سے بدن کانپنے لگتا ہے۔ اپنی سیاہ کاریوں کا پورا خاکہ سامنے چلتا نظر آتا ہے کیونکہ موت کا فرشتہ پوری قوت سے اس کے دماغ کو جکڑ کر اپنا پرتو ڈالتا ہے اور وہ دل ہی دل میں تڑپتا ہے۔

"وہ زندہ رہنا چاہتا ہے"

وہ پھر زندہ رہے گا۔ لیکن ایک دن تو موت آ ہی جائے گی ایک دن تو مر ہی جائے گا۔" نہیں...... ہاں...... وہ اس تصور سے بھاگ جانا چاہتا ہے۔ وہ زندگی کی [illegible] میں کھو جانا چاہتا ہے [illegible] زندہ رہنا چاہتا [illegible]

[illegible] توڑنا نہیں چاہتا۔ اس کی امنگیں جوان ہیں۔ وہ خود جوان ہے۔ اس کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی اور اس کی ایک [illegible] ہے جس کو انڈر سیکریٹری بننا ہے۔ یا اس کو مکان بنانا ہے۔ یا کار خریدنی ہے۔ اسے [illegible] بننا [illegible] یا [illegible] کارخانہ بنانا ہے۔ غرض یہ آرزو پوری ہونے پر بھی [illegible] تکرار ہی رہا۔ وہ مرنا نہیں چاہتا [illegible] گناہوں پر نادم ہے۔ وہ زندگی [illegible] سرے سے شروع کرنا چاہتا ہے وہ گناہوں سے کنارہ کش ہوگا۔ وہ اب دنیا کی رنگینیوں میں نہیں کھو جائے گا۔ کیونکہ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ کہیں سے آواز آتی ہے۔ "جا تجھے ایک بار پھر موقعہ دیا جاتا ہے۔" میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا ہوں وہ مسرور نظر آتا ہے۔ اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ آتی ہے۔ وہ [illegible] ماحول سے بھاگ جانا چاہتا ہے۔ وہ دوڑ رہا ہے وہ بھاگ رہا ہے۔ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ گر گیا۔ اسے چوٹ آگئی۔ چوٹ... ... چوٹ! چپ رہا میں آگے جا رہا آواز آتی ہے... "تجھے جانتے ہو۔ ارے میں تھا۔ وہ لیڈر ہوں جس نے [illegible] لوگوں کو آزادی کے لفظ سے واقف کرایا۔ جب [illegible] نے تم لوگوں

میں آزاد ہونے کے لئے تڑپ پیدا کی تم لوگوں کے لئے میں نے جیل کاٹی۔ اور آج تم لوگ مجھے بھول گئے اتنی جلدی بھول گئے"۔

"محترم میں نے آپ کا نام سنا ہے۔ لیکن آپ کا یہ گلہ چونکہ آپ کو لوگ اتنی جلدی بھول گئے۔ آپ کو یہ شکوہ ہے۔ کہ لوگ آپ کو یاد کیوں نہیں کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے آپ کا بت چوک میں نصب کیا گیا تھا۔ مگر اس بت کا ایک ایک پتھر لیا گیا وہ کسی مکان کی دہلیز کے کام آیا۔ یا کسی آنگن کی زینت بن گیا۔ آج کے بچے کھچے بت پر جس پر گندگی کے ڈھیر پڑے ہیں اور کتے آرام کرتے ہیں۔ آدمی بے دردی سے چلتے پھرتے ہیں۔ آپ کو اب سب بھول گئے"۔

"لوگ تو لوگ مجھے خدا نے بھی فراموش کر دیا" ایڈرس نے کہا "میں نے خدا کی بارگاہ میں التجا کی کہ اے خدا میں نے تیرے بندوں کو آزادی دلانے میں اپنا خون پسینہ ایک کیا۔ اپنی جوانی کو جیلوں کی اندھیری کوٹھڑیوں میں کاٹتا رہا میں نے اپنی جوان بیوی سے منہ موڑ لیا۔ اس نے مجھے اپنی سرکار میں وزیر بنائے۔ لیکن ممبروں نے مجھ پر تہمت لگائی کہ میں نے قومی خزانے سے (دینار نہیں) چار لاکھ روپے غبن کئے

میں نے ظالم کے مالک سے کہا کہ یہ جھوٹا ہے۔ الزام ہے۔ اللہ کو میری صداقت پر غصہ آیا۔ اُس نے مجھے جلا وطن کر کے جہنم میں بھیجدیا۔ یہ کیسا انصاف ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ کیسا انصاف ہے تم نے غریبوں کا خون ہڑپ کرلیا۔ تو نے اپنی قوم سے دغا بازی کی۔ تو نے اپنے گھر کو سونے کی اینٹوں سے بنایا۔ تو نے اپنے لڑکوں کو امریکہ اور ولایت روانہ کیا۔ ان لوگوں نے اعلیٰ تعلیم کس فنڈ سے حاصل کی اس لئے آج تمہارے بچے کچھے بت کو کتے چاٹ رہے ہیں"

میں نے ایک قہقہہ سن لیا۔ میں نے دریافت کیا۔

"یہ کون ہے؟"

"ادیب"

"اچھا"

"مجھے تم جانتے ہو۔ اچھی طرح جانتے ہو۔ میں وہی ہوں جس کے نام پر سرکاری لائبریری بنائی گئی جس کے نام پر ہسپتال بنایا گیا۔ جس کے نام پر ناچ منڈل بنایا گیا۔ لیکن تم جانتے ہو، مجھے زندگی میں کبھی رہنے کے لئے جگہ حاصل نہیں ہوئی۔ پیٹ کے لئے کھانا حاصل نہیں ہوا۔ پہننے کے لئے کپڑے میسر نہیں ہوئے۔ میرا گھر فٹ پاتھ

میری غذا چلتے تھے۔ اور آج میں بہت بڑا آدمی بن گیا ہوں ہر لب پہ میرا نام ہے۔ میرے دوست تم ادیب مت بنو۔ کتابیں مت لکھو۔ اپنے بہترین دماغ کو سادہ کاغذ پر مت ضائع کرو۔ روپیہ جمع کرنے کا ہنر سیکھو۔ ورنہ میری طرح زندگی بھر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ گے۔"

"بھوک"

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ کوئی چیخ رہا تھا۔

"یہ کون چیخ رہا ہے؟"

"مجھے نہیں جانتے ہو؟"

"نہیں"

"ارے میں شہر کا بہت بڑا آدمی تھا۔ آج میرے نام کا سکہ کپڑے کے تھان پر پڑا ہے۔ میں دو کارخانوں کا مالک تھا۔ لیکن آج میں تڑپ رہا ہوں۔"

"لیکن کیوں"۔

"مجھے اب لگا وہ اسٹیٹ نظر آ رہی ہے جو میں نے غریبوں کا لہو چوس کر تیار کی تھی۔ تجوریوں میں نوٹوں کے انبار جمع کئے تھے۔ اور آج اسی دھن کو میرے وارث بے دردی سے پھینکتے جا رہے ہیں۔ اور پائل کی جھنکار پر لٹا رہے ہیں۔ خدائی فوج کے افراد مجھ پر کوڑے برسا رہے ہیں۔ پیاس اور بھوک

کی خدمت سے بیچین ہوں۔ جس اسٹیٹ کو حاصل کرنے
کے لئے بابا نے اچھا کھانا نہیں کھایا۔ اور مجھ کا ڈیول کو بھگا
کے لئے پالا پروا ور کئے۔ کتے پالے، دسیوں میل کا سفر پیدل
کیا۔ اچھے لباس سے گریز کیا۔ اسی دولت سے رات کی
تاریکیوں کو زرق برق بنایا جارہا ہے"

"جس پیسے کی بنیاد غلط اور بربریت سے رکھی گئی ہو
ہیں سے [illegible] آباد [illegible] کے اندر غریبوں کی آہیں اور
فریادیں ہوں۔ اس کا انجام یہی ہوتا ہے"

[illegible] میں تقریباً [illegible] گھوم رہا تھا۔ میں آرام کرنا
چاہتا تھا۔ ایک گھنے سایہ دار پیڑ جو قدرت کی کیاری
کی [illegible] تھا اس کی گھنی شاخوں کے نیچے سورج
کی کرنیں ایک [illegible] بیٹھ کر اپنی [illegible] دوبالا کر رہی تھیں۔
پھر آئینے کی طرح اپنے اطراف کا عکس دکھا رہا تھا۔ میں
وہاں قریب میں بیٹھ گیا اور ماضی کے دھندلکوں میں کھو کر
سوچنے لگا۔

"آپ [illegible] گئے۔ [illegible] ہمیں جہاں میں تنہا چھوڑ کر [illegible]
چھوڑ گئے۔ . . . آپ کہاں کھو گئے"

اچانک ایک بوڑھی آواز فضا میں لہرائی۔

"بیٹا [illegible] یہاں [illegible]"

ہاں یہ وہ دادا تھا۔ ... ہاں وہی پر نور چہرہ، ہاں وہی
سفید نرم ریشمی لمبی داڑھی، جھریوں سے بھرا چہرہ لیکن
رعب دبدبہ سے بھرپور، وہی ممتا بھری آنکھیں، وہ شفقت
بھرے ہاتھ۔ میرا بچپن لوٹ آیا۔ میں نے دلگیر آواز میں کہا۔

"دادا آپ کو یاد ہے۔ جب میں بچہ تھا۔ آپ میرا ہاتھ
پکڑ کر نئے راستوں سے روشناس کراتے تھے۔ آپ کو یاد ہے
... آپ شاید سب کچھ بھول گئے۔ آپ یہاں ہوتے
تو دیکھ لیتے محل کھنڈرات اور کھنڈرات محل بن گئے۔
کیا کیا تبدیلیاں آئیں آپ کے جانے کے بعد کچھ اچھی بھی
کچھ بری بھی۔"

"بیٹا مجھے سب معلوم ہے۔"

"آپ کو سب معلوم ہے۔ لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں
ہیں آپ کے جانے کے بعد کتنا اداس رہا ہوں۔ آپ چلے
گئے۔ لیکن آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میرا ہاتھ کون پکڑے
گا۔ میری ضد کو کون پورا کرے گا۔ محبت سے مجھے کون گلے
لگائے گا۔ کندھے پر کون تھپتھپائے گا۔ ہاتھوں سے میری
جھولی کون بھرے گا۔ آپ چلے گئے۔ مجھے دنیا کے رحم و کرم
پر چھوڑ کر۔"

اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا

"بیٹے تجھے جانا ہی تھا۔ اور ہر ایک کو یہاں سے جانا ہے۔ میرا جسم اس وقت تمہارے ساتھ نہیں بلکہ روح تمہارے ساتھ رہتی ہے"

"میرے اچھے اور پیارے دادا تم اسی طرح کھڑے رہو اور اپنی آپ بیتی سناتا رہوں۔ آپ کے جانے کے بعد میری زندگی میں کتنے انقلاب آئے کبھی موت اور کبھی زندگی کے درمیان جنگ ہوتا۔ کبھی شیطان کے ہاتھ تک جانا پڑا۔ کبھی رحمت کے فرشتے کی آغوش میں پناہ لی۔ میں وہ سب کچھ آپکو سنانا چاہتا ہوں۔"

"بیٹے تمہاری آنکھیں بوجھل ہو رہی ہیں تم کو نیند آرہی ہے میرے لال پھر باتیں بتانا میں اب تمہارے پاس ہی ہوں۔ آؤ میری آغوش میں۔ میں تم کو تھپکتا ہوں۔۔۔ سو جاؤ"

جب نیند سے بیدار ہوا ہر طرف تاریکی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ دادا کھو گیا تھا۔

قلوپطرہ

میں نے سنا ہے کہ مصر کی حسین ملکہ قلوپطرہ بڑی فراخدل

عورت تھی۔ قلوپطرہ ایک ایسی حسین وجمیل دوشیزہ تھی۔ جس کی وجہ سے مصر اور روم کے درمیان خوفناک جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں یونان کی ناریاں بیوہ ہو گئیں۔

اس حسین ملکہ اپنے حبشی غلاموں کی بڑی قدردان تھی۔ یہ حبشی غلام اپنی ملکہ کے حسن کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ لیکن ملکہ ان کے اشتیاق کو پورا کرتی تھی۔ شوق ختم ہوتے ہی اس غلام کو زہر کا جام پینا پڑتا تھا اور قلوپطرہ اس مرتے ہوئے غلام کو دیکھ کر بڑا سکون محسوس کرتی تھی۔

اسی حسین قلوپطرہ کا یہ واقعہ مجھے اس دن یاد آیا جب میں کلکتہ کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ کیونکہ آجکل اس حسین ملکہ قلوپطرہ کا بھوکا پیٹ کلکتہ کی سڑکوں پر بھیک مانگ رہا ہے ایک وہ زمانہ تھا جب قلوپطرہ کے ایک اشارے پر لوگ اپنی جانیں نچھاور کرتے تھے ایک یہ زمانہ ہے کہ قلوپطرہ کے بھوکے پیٹ پر لات مارتے ہیں۔

یہ بھکارن بھی حسن وجمال میں قلوپطرہ سے کم درجہ نہیں رکھتی ہے۔ اس کی لمبی لمبی سیاہ مست کر دینے والی آنکھیں آنکھوں کے سیاہ ڈورے، گیہوں رنگت - نازک خدو خال ...... ڈھلتی ہوئی پتلی ساری جھی چہرے پر معصومیت بکھیر دیتی۔ لباس اور چال سے پوری طرح بیکسی کا شکار

"ہمیں اسے تھوڑا قریب آتے ہوئے کہا۔

"قلوپطرہ تمہیں کیا ہو گیا؟"

اس نے اپنے پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدتے ہوئے

"ہمارے لئے کسی کے دل میں محبت نہیں رہی"

"محبت ۔۔۔۔۔ محبت کیا ہے"

"محبت ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جس میں کوئی جنگل جنگل در در خاک چھانتا رہا۔ کوئی فرہاد بن کر دن بھر [illegible] رہا۔ کوئی مہیوال بن کر نارے لگاتا رہا۔ کوئی شاہجہاں بن کر تاج محل بنا دیتا۔ محبت کی دنیا میں ہر طرف بھکاری ہی نظر آئیں گے۔ کوئی شہنشاہ نہیں ملے گا۔"

"کیا اب کوئی نئے لیلیٰ، فرہاد، مجنوں، رومیو نہیں [illegible]"

قلوپطرہ کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا "آج کی دنیا میں پرانا فرہاد نہیں ہے۔ برسوں میں پہاڑ کو دودھ نہ سے بلکہ سیکنڈوں میں پہاڑ کو اڑا دینے والا اور راکٹ پر سوار ہو کر چاند پر اتر سے جانا؟ حالانکہ سائنس کے اس دور میں انسان خود ایک مشین بن کے رہ گیا ہے۔"

"اور جنس"

"میں سمجھ گئی" قلوپطرہ نے کہا: "آجکل کے اس زمانے میں جنسیات کا زیادہ اثر رہتا ہے۔ چونکہ جنسیات کا زیادہ اثر

رہنا ضروری ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان جب تک جذبات کے رشتے نہ ہوں تب تک انسانی کائنات کھڑی نہیں رہ سکتی ہے۔ انسانی کائنات کا دار و مدار جذبات پر ہی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ کس قسم کے جذبات کے لحاف میں گھس جانا چاہتے ہیں۔ کوئی آپ کی بیوی بن سکتی ہے۔ کسی کو معشوقہ کسی کو بہن، ماں کا روپ دے سکتے ہیں۔ لیکن جنسی تصادم سب ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب آپ کے اصول پر منحصر ہے۔ اگر آپ گاندھی جی کی طرح اپنی بیوی کو بہن کہنے لگے تو انسانی آبادی گھٹتے گھٹتے ختم ہو جائے گی۔

DRAWIN کی کتاب کہتی ہے۔ کہ پتھر کے زمانے میں جب انسان کپڑوں کے پہننے سے بے نیاز تھا۔ اس تہذیب کو آجکل وحشی زمانہ کہتے ہیں۔ اس زمانے میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی بھی رشتہ نہ تھا ایک آدمی کا کسی بھی عورت کے ساتھ جنسی تصادم ہوتا تھا۔ آجکل کے زمانے میں بھی ایسے وحشی زرق برق لباس میں ملبوس پائے جاتے ہیں۔ وہ رشتوں سے بے بہرہ نہیں لیکن پھر بھی وحشی بن جاتے ہیں"۔

"قلوپطرہ تمہاری تعلیم کیا ہے"۔

"ہوں...... تعلیم...... سند...... سب فضول ہے"

"اچھا قلوپطرہ عورت کی کتنی قسمیں ہیں"۔

"بہت لیکن یہ سب بننے کے لئے عورت کو حالات مجبور کرتے ہیں۔ کوئی طبلہ کی تھاپ پر تھرکتی ہے کوئی پارک میں.... لیس اسٹینڈ ..... کوئی سوسائٹی گرل اور کوئی چار دیواری میں رہ کر دیوی کا روپ دھارتی ہے۔"

"اچھا قلو پطرہ بہت باتیں ہو گئیں اب میں چلتا ہوں۔"

"جا رہے ہو.... بھوک.... پیٹ..... حسن.... کسی کا کچھ خیال ہی نہیں۔"

قلو پطرہ بیچاری کو کیا معلوم کہ اس گرانی کے زمانے میں دس پیسے کتنی وقعت رکھتے ہیں۔ پھر بھی میں نے اُس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر دس پیسے رکھے وہ دوڑ کر سامنے کے چائے خانے میں گھس گئی۔ جہاں وہ جنسیات کے بارے میں سوچ لے گی۔ جہاں وہ رسل سے ملاقات کرے گی۔

چلتے چلتے میں بھی ایک ہوٹل میں گھس پڑا۔ یہاں ایک عورت اپنے پورے جوش سے ناچ رہی تھی وہ اتنی حسین تھی کہ قلو پطرہ بھی اُس کے حسن پر فریفتہ ہوتی۔ ایسی حسینہ کا تصور خواب میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کا حسن حقیقت کی سرحدوں کو پار کرتا تھا۔

میرے سامنے کی میز پر دو نوجوان باتیں کر رہے تھے حسینہ نے جب رقص ختم کیا۔ تو وہ نوجوان کی میز پر آگئی۔

"ہلو ریٹا"

"ہلو"

"یہ میرا دوست سلطان ہے۔ آپ کو دل دے بیٹھا ہے۔"
قلوپطرہ کے چہرے پر قاتلانہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

"اچھا..... اچھا تو پھر اسکو میرے فلیٹ نتاجی روڈ پر لے آؤ۔" اس کے ساتھ حسینہ اٹھی..... نوجوان نے اپنے دوست سے کہا۔

"تیار"

"لیکن پچاس روپے"

"یہ حسن اور پچاس روپے"

"نہیں... نہیں میں پچاس روپے اس آسانی سے برباد نہیں کر سکتا ہوں۔"

قلوپطرہ کا حسن صرف پچاس روپے اور اس میں بھی آنا کانی..... یہ کوئی زہر کا پیالہ نہیں لیکن پچاس روپے اس زمانے میں زہر کے پیالے سے زیادہ ہیں۔ زہر کے پیالے سے انسان ایک ہی بار مرتا ہے۔ اور زندہ رہ کر بار بار مرتا ہے

اندھیرا پھیل دیہ

اس کی عمر تیس سال تھی۔ لیکن اس نے اب تک شادی نہ کی تھی۔ شادی نہ کرنے کی ایک خاص وجہ تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ شادی کے بعد اس کی بیوی بوڑھی ماں کے لئے ایک طوفان بن جائے گی اس لئے وہ ایسی زحمت خریدنے کے لئے تیار نہ تھا۔ جو اس کے اور اس کی ماں کے درمیان طوفان کھڑا کر دے

لیکن اس کی ماں کو حسرت تھی کہ وہ اپنے ویران گھر کیا پیاری سی بہو لائے ہر ماں کی یہ خواہش ہوتی ہے۔ کہ وہ بڑھاپے میں اپنی گود میں پوتے کو کھلائے۔ اس کی بوڑھی ماں کی بھی یہی خواہش تھی۔ لیکن وہ اپنے فیصلے پر سنگ گراں کی طرح قائم تھا۔

آخر اس کی بوڑھی ماں نے اپنے رشتہ داروں اور اقبال کے دوستوں کو جمع کیا۔ اور ان سے اپنی تمام روداد بیان کی۔ وہ سب لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ ان لوگوں نے اقبال کو شادی کرنے کے لئے مجبور کیا۔ آخر خدا خدا کر کے اس کی شادی ہوئی۔ وہ ایک متوسط گھرانے کا فرزند تھا لیکن پھر بھی یہ شادی بڑے چاؤ کے ساتھ ہوئی۔

اُن کی بیوی ایک سکول میں ٹیچر کا کام انجام دے رہی تھی۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو ملکہ نور جہاں سے کم نہ سمجھتی تھی بہت تند [illegible] دماغ اور چڑچڑی بھی تھی۔ وہ شوہر کو ہاتھ میں لانے کے لئے بہت سے گر جانتی تھی۔ اور ان کا ایکسپریمنٹ (EXPRIMENT) اُس نے "خاوند و بیوی" "ازدواجی زندگی کا روزنامچہ" "شادی" اور "رفیقہ حیات" [illegible] کتاب پڑھکر سیکھے تھے۔ خیر ان کتابوں سے ایک اچھا سبق اُس نے حاصل کیا تھا۔ اُس کا شوہر اسکا گرویدہ ہو چکا تھا۔ لیکن مہارانی ایک استانی تھیں اس لئے بوڑھی کو خیال میں بھی لانا ان کی انتہا توہین تھی۔ اگر بوڑھی کسی وقت کہتی

"بیٹی ذرا کام میں ہاتھ بٹاؤ۔"

وہ غصیلی آواز میں کہتی "ساس جی دن بھر لڑکیوں کے ساتھ دماغ کھپاتی رہتی ہوں۔ انگ انگ میں درد ہو جاتا ہے۔ پھر گھر میں آکر آپ کے ہاتھ کے سہنے پڑتے ہیں۔ میں استانی ہوں گھر کی نوکرانی نہیں ہوں۔ پورے ایک سو بیس روپے گن کر مہینے پر لاتی ہوں"

بوڑھی عورت اُس کی جوان تقریر سن کر چپ سادھ لیتی۔ مہارانی جی پر انگریزوں کا کافی اثر تھا۔ اس لئے نتی الصباح بیڈ ٹی کی عادی تھیں۔ اس لئے بوڑھی فجر کی

نماز سے فارغ ہو کر لڑکھڑاتے قدموں سے چائے بنانے جاتی
اقبال نے کئی بار ماں کو اس بیجا حرکت پر ٹوکا۔ لیکن وہ سنتی کہاں تھی
تھی۔ نہ کہتی۔

"اے ہے بیٹا۔ بیچاری ہمارے لئے سکول جاتی ہے۔
بس ایک پیالی چائے بنانے میں گھس تھوڑی جاؤں گی۔" اپنی
بوڑھی ماں کا بہو کے ساتھ یہ مادرانہ رویہ دیکھ کر نہ جانے کیوں
اقبال کی آنکھیں آبدیدہ ہو جاتی تھیں۔ لیکن تعلیم یافتہ بہو کا
دماغ آہستہ آہستہ بگڑتا ہی گیا۔ ساس کے ساتھ ایک دو
لڑائیاں کرنا اُس کا معمول بن گیا تھا۔ بڑھیا سب کچھ برداشت
کرتی مگر اقبال سے کچھ نہ کہتی۔

بہو نے سوچ لیا کہ یہ بوڑھی ایسے گلے پڑی ہے کہ اس
کا نام ہی نہیں لیتی اس لئے اُس نے اپنے ہنر کا دوسرا حربہ
استعمال کیا اور یہ اپنے شوہر پر آزمایا۔ اس کو پورا یقین
تھا کہ وہ مان جائے گا۔ کیونکہ وہ پہلے ہی اُس کا شیدائی
ہو چکا تھا۔ اور ایک دن قریب کھسکتے ہوئے استانی صاحبہ
نے معصومانہ انداز میں کہا۔

"دیکھئے آپکی والدہ مجھکو بہت ستاتی ہیں۔ کہتی ہیں تو نے اقبال
پر جادو کر ڈالا ہے اور نہ جانے کیا کیا کہتی ہیں۔ میرا آخری سہارا مجھ سے چھین لیا
۔۔۔ مشکل ہے" اقبال تھوڑی دیر

چپ رہا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کی ماں اُس کی بیوی سے ساتھ محبت سے پیش آتی ہے۔ وہ حیران تھا کہ اس کی بیوی یہ الٹی سیدھی باتیں کیوں کرنے لگی۔ اُس نے کہا۔

"تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں!" اُس نے رکتے رکتے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ ماں الگ رہے اور ہم الگ۔۔۔۔"

"اچھا" اس نے کہا۔ "الگ! ہاں اب اس کے سوا چارہ بھی نہیں۔ کل سے ہم الگ ہو جائیں گے۔" وہ مسرت سے چیخ پڑی۔۔۔۔ "آ۔۔۔ اب میں بہت خوش ہوں کم از کم ان روزانہ جھگڑوں سے نجات حاصل کروں گی۔"

رات کو اُس نے نہ جانے کیا کیا خواب دیکھے خواب میں اپنی پسند کا باورچی خانہ مرتب کیا۔ اور نئے فیشن سے پوری طرح گھر کو ترتیب دیا۔ اور نہ جانے کیا کیا۔۔۔۔

لیکن جب صبح آئی اس کی تمام امیدوں پر اوس پڑی کیونکہ اس کے خاوند نے قاضی جی کو بلا کر طلاق دیدی اس کے سب خواب مٹی میں مل گئے۔ بیوی کے ماں باپ نے شور مچایا لیکن سب بے سود۔ دوسرے لوگ اس طلاق کی وجہ ماں کو سمجھتے تھے۔

اقبال کی ماں کو جب یہ قصہ معلوم ہوا اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ بہو کو بڑے چاؤ سے لائی تھی اور پوتے کا خواب دیکھ رہی تھی۔ لیکن یہ سب پانی کے بلبلے کی طرح ختم ہو گیا۔ اور اس کی تمام

امیدیں خاک میں مل گئیں۔

اقبال جب گھر آیا تو اس نے ماں کے ارد گرد محلے والوں کو پایا۔ اس کی ماں کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ اس نے بچوں کی طرح بلکتے ہوئے ماں سے کہا "ماں"

"بیٹا" اس نے کہا۔ "ہو...لا...ئے"... یہ کہتے ہی ہچکی آئی۔ اور بوڑھی ہمیشہ کے لئے سو گئی۔ اقبال چیختا رہا۔

اب اقبال کی بیوی کے ماں باپ لوگوں سے کہہ رہے تھے۔ کہ خدا نے بوڑھی کو ہماری معصوم بیٹی کی زندگی برباد کرنے کی سزا دی ہے۔ اور لوگ بزرگانہ انداز میں سر ہلا کر کہتے رہے "سچ ہے اس کی لاٹھی بے آواز ہے"۔

رازِ تصویر

تمام کائنات اندھیرے کی آغوش میں سوئی ہوئی تھی۔

وہ بستر سے باہر آئی اور آئینہ کے سامنے بیٹھی غور سے اپنے چہرے کو دیکھنے لگی۔ سیاہ بڑی آنکھیں سپید سرخ چہرہ ستواں ناک چاندی کی طرح چمکتے چہرے پر بل کھاتی سیاہ زلفیں جیسے سیاہ بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔

اس کو محسوس ہوا کہ اس کا حسن اس کو منہ چڑا رہا ہے اس نے انگڑائی لی [illegible] سے ایک تصویر [illegible]

ہاتھ میں لی۔ اُس کے حسین چہرے پر باغیانہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

مگر چند ہی منٹ کے بعد یہ مسکراہٹ ختم ہو جائے گی پھر اُس نے دیکھا کہ شیشے میں ایک عکس اُبھرا۔

"یہ اقبال کہاں سے آگیا۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔ اس کے ساتھ ایک طویل کہانی وابستہ تھی۔ ہاں اب تو ایک کہانی ہی ہے۔ نگاہوں سے پردے ہٹتا رہے تھے۔ اسے یاد آیا وہ اپنے پاؤں کو ٹھنڈ پہونچانے کے لئے ساحل پر ننگے پاؤں چلتی۔ موجیں اس کے پاؤں چھو کر ہٹ جاتیں اس کو محسوس ہوتا یہ بیکراں سمندر اُس حسین کی ملکہ کو سلام و پیام بھیج رہا ہے اور اسی ساحل پر اپنے آنے والے رنگین دنوں کے خواب میں کھو جاتی۔ اور ریت کا گھروندہ بنانے میں خوشی محسوس کرتی تھی۔

ایک دن ایک اجنبی اس کے ریت کے گھروندے کو غور سے دیکھنے لگا۔

رضیہ نے گھبراہٹی گردن کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے... کیا دیکھ رہے ہو؟"

"جی آپکا تعمیر کیا ہوا محل دیکھ رہا ہوں"۔

"او! آپ ڈگری یافتہ لوفر معلوم ہوتے ہیں!"

"میں... جی میں لوفر! آپ نے یہ رائے کیوں قائم کر لی؟"

"ارے مسٹر" رضیہ نے غصیلی آواز میں کہا" یہ بھولی بھالی

لڑکیوں کو بہلانے کا اچھا طریقہ ایجاد کیا۔ جائیے اپنا راستہ ناپئے۔"
شاید پچھلے وقتوں میں فرہاد نے بھی یہی شیریں سے کہا ہوگا۔ لیکن اس ماڈرن فرہاد کی دوسری ملاقات شادی کی ایک تقریب پر ہوئی دولہا کے ساتھ تھا۔ لڑکیاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ اجنبی نے جب رضیہ کو دیکھا تو کہا۔
"آداب"
"تو جناب یہاں بھی آگئے"!
"دیکھئے آپ ہر وقت بے عزتی کرنے پر کمر بستہ ہیں اور ہم ہیں کہ سہے جاتے ہیں۔ اب ہم برداشت نہیں کر سکتے۔"
"تو جناب نے اب اخلاق کی سرحد کو بھی پار کر لیا۔"
"شور مت اٹھائیے۔"
"آنکھیں دکھاتے ہو۔"
"دیکھئے مس صاحبہ!! میں ایک شریف انسان ہوں"۔ پھر بھاری آواز میں کہا "اگر آپ میری الٹمیٹم پر تلی ہوئی ہیں تو پھر برات واپس لوٹا جائے گی۔" واپسی کا لفظ سنکر رضیہ سٹپٹا گئی اس نے کہا۔
"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"
"وعدہ کیجئے کل چوپاٹی پر ملنے آئیں گی۔"
"او" عاجز آکے رضیہ نے کہا۔ "اچھا آتی ہوں"۔
پھر ان کی تیسری ملاقات ہوئی جو تھی ملاقات ہوئی عہد و پیمان ہوئے کہ شادی دیگر ایک ساتھ مرنے جینے کا اقرار ہوا۔

رضیہ کی سہیلی رضیہ سے کہتی، "آجکل عشق کے میدان میں ایسی دوڑ رہی ہو کہ کھائی، خندق کا پتہ ہی نہیں نہ آگے نہ پیچھے کی کچھ خبر۔ ماں نے بمبئی تعلیم حاصل کرنے بھیجا۔ لیکن صاحبزادی رومانٹک بن گئی۔ خیر مجھے اس سے کیا غرض تمہاری بہن کا خط آیا ہے ..... یہ لو" رضیہ نے خط پکڑا۔ اور سہیلی کو سمجھانے لگی لیکن وہ سننے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس نے بہن کا خط کھولا ایک فوٹو دیکھ کر ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے جلدی سے خط کا مضمون پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔

پیاری بہن

امید ہے کہ تم خیریت سے ہو گی۔ لیکن میرا حال خراب ہے تم میری شادی پر نہ آ سکیں رنج و ملال ضرور ہوا۔ لیکن شکوہ نہیں ہے کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ تم امتحان کی مصروفیات میں گھری ہوئی تھیں۔

بہن میں شادی کر کے پشیمان ضرور ہوئی کیونکہ وہ میرا گرویدہ نہ بن سکا۔ چند ہی دنوں میں وہ مجھ سے روٹھ کر چلا گیا۔ سنا ہے وہ بمبئی میں کسی لڑکی کے زلف کا اسیر بن چکا ہے۔ اور جلد ہی شادی رچا رہا ہے لیکن میری پیاری بہن تم میرے سہاگ اجڑنے کو روکنے کی کوشش کرو۔ مجھے امید ہے کہ تم اس کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔

تمہاری بدنصیب آپا
نجمہ

وہ پسینے میں شرابور ہو رہی تھی...... اور فوٹو کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اُس کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ اقبال کا فوٹو ہے۔ کل اُس کی شادی اقبال کے ساتھ ہو رہی ہے۔ لیکن اقبال تو اس کا سگا بہنوئی ہے اس کے تمام بنائے ہوئے محل چکنا چور رہے۔

لیکن اُس نے زہر کیوں پی لیا۔ وہ محبت سے انکار کر سکتی ہے۔ شادی سے انکار کر سکتی ہے........ شادی سے انکار کر سکتی ہے.......... مگر.......... کیسے انکار کر سکتی ہے۔ اُس نے موت کو کیوں گلے لگایا......؟

آنکھ نہ دیکھ سکی

" اب قمیض کہاں کھو گئی!"

وہ بڑبڑانے لگا۔ سوٹ کیس میں کپڑے رکھے۔ اب سب کچھ تیار تھا۔ لیکن پہننے کے لئے جو قمیص رکھی تھی وہ کھو گئی۔ اپنے ذہن پر زور دے کر پھر مسرت سے چیخ پڑا۔

" او ہو...... وہ تو میں نے غسل خانے میں رکھی ہے!"

وہ اب بالکل تیار ہوا۔ لیکن اُس کا دوست آدھمکا۔ دوست نے آتے ہی اُس سے کہا۔

"کیوں جی! موہن تم سرینگر جانے کے لئے تیار ہو؟"

"ہاں ارشد" اب تو بس چھوٹنے میں صرف تیس منٹ رہ گئے ہیں۔ اب جلدی چلنا چاہیئے

"آہا" ارشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیوں؟ بیوی کی یاد ستانے لگی۔ آ۔ یاد آیا۔ تم تو اپنی دلہن کے پاس صرف دو گھنٹے رہے تھے۔ آ... یاد آیا تمہیں سرینگر جانا ہے چلیے آؤ۔"

وہ جموں کے پوسٹ آفس میں ایک معمولی کلرک تھا اور آج پورے دو سال کے بعد اپنے وطن واپس جا رہا تھا۔ اس کا دوست بس اسٹینڈ پر اس کو الوداع کرنے آیا تھا۔ بس میں بیٹھ کر اس کو وطن کی میٹھی میٹھی یاد ستانے لگی کشمیر کی چھوٹی سی گل پوش وادی۔ جس کے چاروں طرف فلک بوس پہاڑ سنتری کی طرح اس کی حفاظت کر رہے ہیں جہاں آسمان کی پیشانی کو چھونے والے دیودار اور چنار کھڑے ہیں۔ جہاں ہر طرف چشموں سے بازگشت کی صدائیں آ رہی ہیں۔ اس ہی وادی میں اس کے دل کی دنیا آباد تھی اس کو اپنی پیاری بیوی کی یاد آنے لگی۔ جس کے ساتھ اس کی ملاقات صرف دو گھنٹے ہوئی تھی۔ اس کو اپنی بیوی کی شکل بھی اچھی طرح یاد نہ رہی تھی۔ ہاں تصور میں اس نے ایک خاکہ مرتب کر لیا تھا۔

ایک دن کے طویل سفر کے بعد اس کی گاڑی وادیٔ

کشمیر میں داخل ہوئی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔
مسرت کی دبی چیخ اس کے منہ سے نکل گئی۔

امیرا کدل کے بس اسٹینڈ پر اس کو اپنا دوست اکبر ملا۔ اکبر نے اس کو گلے لگایا۔ اکبر نے جلدی جلدی اس سے تمام حالات معلوم کئے۔

"چلو یار یہاں کب تک کھڑے رہو گے ایک دو کپ چائے ہی پی لیں"۔

"لیکن دوست میں ابھی ابھی گھر جانا چاہتا ہوں۔"

"چلو نا، یار"

وہ سامان ایک آدمی کی حفاظت میں دے کر سامنے والے ہوٹل میں گھس گیا۔ اکبر نے چائے کا آرڈر دیتے ہوئے کہا۔
"اور سناؤ جموں کی آب وہوا راس آئی وہاں تمہاری صحت کا کیا حال رہا!"

"اچھی خاصی رہی"

وہ ہوٹل کی اوپری منزل میں سڑک کے پاس والی کھڑکی کے نزدیک بیٹھے تھے۔ اسی اثنا میں رنگین ساڑھی میں ملبوس ایک لڑکی تیزی کے ساتھ جارہی تھی۔ لڑکی بے حد دلکش تھی۔ موہن نے دیکھتے ہی کھڑکدار سیٹی بجائی۔

اکبر نے کہا "کیوں"۔

"نیچے دیکھ یار پری آسمان سے اتر آئی ہے کیا حسن پایا ہے کمبخت نے" موہن نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا

بھگوان قسم نجی چاہتا ہے سرڈکسٹ سے اٹھا لوں۔ اس ناگن کو"
پھر اُس نے لڑکی کی طرف اشارہ کرنے کی سیٹی بجائی۔ لیکن لڑکی
بے تابی سے سر لبس کو دیکھ رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا وہ
بے چینی سے کسی آنے والے کا انتظار کر رہی ہے۔ اکبر نے
طنزیہ انداز میں کہا۔

"موہن جوان بیوی کے ہوتے ہوئے یہ بات تمہارے لئے نازیبا ہے"
"کیا! ارے چھوڑو یار ان کتابی باتوں کو کون ہے جو اس حسن کے
سامنے نہ جھک جائے اسکو دیکھ کر فرشتوں کے قدم بھی بہک جائیں گے"
"ارے یار ابھی تو تم ہوا کے گھوڑے پہ سوار تھے کہ مجھے گھر
جلدی جانا ہے۔ اب حسن نے تمہارے پیروں میں بیڑیاں ڈالدیں"
"ارے ہاں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں" اکبر نے اُس سے
گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "ضرور"

ہوٹل سے اٹھ کر وہ سیدھا گھر روانہ ہوا۔ گھر پہ بے صبری
سے اُس کے والدین اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے دیکھ
کر خوب بلائیں لیں وہ دو سال کے
لمبے عرصے کے بعد گھر آیا تھا۔

جب تھوڑی دیر کے بعد وہ کمرے میں داخل ہوا تو اُس
نے ایک کونے میں شرماتے ہوئے اُسی ہی لڑکی کو دیکھا وہ سمجھ نہ سکا
یہ کون ہے اس لئے اپنے دل میں کہا یہ شاید پتاجی کے دوست کی
بیٹی ہے۔ لیکن اب اُس کو اپنی ناشائستہ حرکت یاد آنے لگی اُس
نے سوچا یہ شاید پتاجی سے میری شکایت کرنے آئی ہے۔

اب کیا ہوگا۔ خوف اور شرم کے ملے جلے جذبات سے اُس کا دل ڈوبنے
لگا۔ اُس نے ماں سے کہا۔

" ماں ... یہ ... یہ .. ک ... کون ہے؟ "

" ارے یہ بیٹا اپنی پتنی کو نہیں پہچانتے؟ "

" اوہ! پتنی " کسی خیال کے آتے ہی اُس نے دوبارہ چونک کر کہا۔ " میری اپنی پتنی " آئینے میں اُس نے اپنی صورت سے سوال کیا۔ کیا یہ وہی ہے تمہاری ..... جس کو تم نے سر بازار ننگا کر دیا تھا " کیا انسان اس قدر اندھا ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو زمین میں گڑھتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

پیار کی چھاؤں

ماں کے لفظوں میں کتنا جادو بھرا ہے۔ ماں کے لفظ میں ایک عجیب مٹھاس ہے۔ ماں پیار کا بھرپور مجسمہ ہے اسی پیار کی چھاؤں تلے ہی بچہ جوان ہوتا ہے۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں۔ جب میں بیمار ہوا اور ماں … سینے سے لگا کر سوتی میں نے ایک خواب دیکھا۔

ایک بہت بڑے میدان میں اپنے آپ کو پایا۔ اور ایک فرشتہ سیر … بزرگ کو زمرد کے تخت پر دیکھا میں نے حیرت سے دریافت کیا۔

"آپ کون ہیں اے نیک بزرگ؟"

"مجھے نہیں پہچانتے؟"

"نہیں تو"

"میں پیار ہوں۔"

"اچھا"

"میری ایک بیٹی ہے۔" انہوں نے ایک کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ"

"ارے ... وہ تو میری ماں ہیں۔"

"اچھا ... لیکن بیٹا اب وہ تیری میری دنیا میں واپس نہیں جائیگی"

"نہیں" میں چیخ پڑا۔ "وہ میری ماں ہے وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جائے گی۔" میں ماں کے پاس جاتا ہوں۔ اور ماں تجھے یاد ہے۔ جب دھرتی کے بیٹوں نے دھرتی کو اپنے خون سے لالہ زار کیا تجھے یاد نہیں جب گولیوں اور توپوں کی آواز سے زمین کا دل دہل رہا تھا۔ جب امن سے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ تو نے مجھے دنیا کے اس اندھے راج سے چھپا لینا چاہا تھا تاکہ نفرت کے جو ناگ پل رہے تھے۔ ان کا منحوس سایہ میرے اوپر نہ پڑے تو نے مجھے اپنی گود میں چھپا لیا۔ میری ماں تو مجھ سے روٹھ کر جا رہی ہے۔ ماں میں کیسے زندہ رہوں گا۔ تیرے بغیر زندگی میں جانے کتنے نشیب و فراز آئیں گے۔ مجھے ان سب کے لئے تیرے سہارے کی ضرورت چاہیئے۔ سوچتا ہوں جب تو چلی جائے گی۔ تب... ماں ایک بار پھر سے اپنا شفقت بھرا ہاتھ میرے سر پر رکھ دو۔

ایک بار مجھے سینے سے چمٹا کر دنیا کے اندھیرے سے دور کر دو ماں میں طوفان کی لہروں میں تنکے کی طرح بے سہارا ہوں

ہیری .... آہ

پیاری ماں مجھے تیری آغوش چاہئیے"

" دور کر دو اس کو اپنی ماں سے!" بزرگ نے کڑک دار آواز میں کہا۔" اے نادان بندے تو نے اپنی ماں کی قدر کب کی تو نے کبھی اپنی ماں کو خوش رکھا تو نے اُس کی ممتا اور پیار کو یاد کیا۔ بیٹے ماں باپ کی خدمت سے ہی عظمت پاتے ہیں۔ تم نے ایسا نہیں کیا لے جاؤ اس گنہگار بندے کو۔ یہ اس دربار کے قابل نہیں۔ جاؤ"

"ماں" میں چیخ اٹھا۔ ماں نے جب یہ فریاد بھری آواز سن لی۔ اور جکڑے ہوئے پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر اٹھی اور زنجیریں توڑ کر مجھے اپنی گود میں لے لیا اور بھینچ کر بلائیں لینے لگی۔ خواب سے آنکھ کھلی اپنا سر ماں کی گود میں پایا۔ اُس کی آنکھوں میں ممتا کی چمک موجیں مار رہی تھی اور اُس کے شفقت بھرے ہاتھ مجھے ایک بار پھر زندہ رہنے کے لئے مجبور کر رہے تھے۔

دلّال

دلال دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو چیزوں کا سودا کرتا ہے مثال کے طور پر جواہرات قالین اور مکانات کا اور دوسرا وہ ہے جو انسانی جسموں کا کرتا ہے۔ یہ دلال انتہائی خطرناک ہوتا ہے اس کی دلالی سے اُس کی اپنی سگی ماں بہنیں بھی محفوظ نہیں رہ سکتی ہیں۔ عام طور پر یہ غنڈے ہوتے ہیں۔

اسی طرح رحمان علی بھی ایک دلال تھا۔ دلال کا کوئی دوست نہیں ہوتا ہے۔ اُس کا دوست وہی ہے جس سے چار پیسے کما سکے لیکن انور اُس کا لنگوٹیا یار تھا۔ انور ایک امیر خاندان کا لڑکا تھا۔ نوجوان اور خوبرو تھا۔ اور جیب نوٹوں سے بھری رہتی تھی۔ لیکن جب رحمان اُس کا کسی سے تعارف کراتا تھا۔ انور ایک چھدام بھی جیب سے خرچ نہ کرتا۔ رحمان اُس کو کسی کسی وقت شراب کے جام بھی پلاتا یہ سب کچھ وہ مفت ہی کیا کرتا تھا۔ انور اور رحمان کی دوستی کے چرچے سارے شہر میں ہو رہے تھے۔ وہ جدھر سے جاتے لوگوں کی نفرت آمیز نگاہیں ان کی طرف اٹھ جاتیں۔

انور ایک غریب لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ اُس کو بے حد پسند کرتا تھا۔ اُس لڑکی کے باپ نے اُس کو رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ انور لوفر اور شراب خور

قسم کا آدمی تھا۔ اور ایسے ہی بہت سے آدمیوں کی صحبت میں رہتا تھا۔ اس لئے کوئی بھی شریف آدمی اس کی دولت سے مرعوب نہ ہوتا تھا۔ اس کے نام سے اپنی لڑکی کو اس طرح چھپا لیتے جیسے بھیڑیئے سے بکری۔

وہ ہر طرف سے مایوس لوٹا آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے لنگوٹیا یار رحمان سے مدد لے گا۔ اس نے اپنے دوست سے کہا۔ "یار میں تم سے کیا چھپاؤں۔ شہر میں کوئی بھی شریف آدمی اپنی بیٹی دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اور میں جو ہوں لوگوں کی خوشامدیں کرتا پھر رہا ہوں۔ مجھے ایک لڑکی بے انتہا پسند آئی بس یوں کہو میں اسے تن، من، دھن سب کچھ دینے کے لئے تیار تھا۔ لیکن جونہی اس لڑکی کے باپ سے بات چھیڑی اس نے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ بس میرا یہی دل چاہتا ہے کہ ضمیر خان نے جب انکار کیا ہے غیرت اور شرمندگی سے اپنے آپ کو زمین میں گڑھتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ کسی دریا میں ڈوب مروں۔"

رحمان نے زیر لب مسکرا کر کہا "مجھ جیسے اعلیٰ دوست کے ہوتے ہوئے تم کو اتنا لمبا نہیں سوچنا چاہیئے۔ تم یہی چاہتے ہو کہ تم زکیہ کی زلف کے سائے میں اپنی محبت کو عملی جامہ پہناؤ۔ وہ تمہاری شریک حیات بن جائے۔"

"ہاں، ایسا ہی کچھ کیا چاہئے دوست انکھیں"۔ انور خوشی سے بول پڑا۔

لیکن انتقام کا ... لڑکی ... رحمان

نے کہا۔

"پھر ملاؤ ہاتھ وہ تمہاری بیوی بن گئی۔ ایک زکیہ کیا ہم ہزار زکیہ کو تمہارے بستر کی زینت بنادیں گے۔"

رحمان اپنے بیوپار کو کمال تک پہونچا چکا تھا۔ وہ اس وقت شہر اور بیرون شہر کا مانا ہوا بیوپاری تھا۔ اس کے اسٹاک میں بے شمار عورتیں اور لڑکیاں تھیں۔ جن میں شریف زادیاں اور طوائف زادیاں سب ہی تھیں۔ معصوم لڑکیوں کو اغوا کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ زکیہ اس کے خوفناک پنجہ سے نہ بچ سکی۔ جب رحمان زکیہ کو اغوا کر کے لایا۔ اس نے زکیہ سے کہا۔

"فکر مت کرو۔ میرا دوست تیرے ساتھ شادی کرے گا۔ تیری زندگی میں چار چاند لگ جائیں گے۔"

زکیہ نے غصہ میں بھراتے ہوئے اس پر تھوکا اور کہا۔

"نیچ ذلیل جو انسان اپنی ماں بہنوں کی تجارت کر سکتا ہے کیا اس کا دوست پارسا ہوگا؟ وہ ذلیل کتا میرے ساتھ شادی کرے گا؟"

"دیکھو چھوکری لال مرچ مت بن میں نے جو عہد کیا ہے وہ ہر حال میں پورا ہوگا۔"

انور نے جب پہاڑ کے مکان میں زکیہ کو پایا سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی ہاتھ کرنے اس پر اپنا پورا تسلط جما کر

اُس کے ضمیر کو راکھ کر دیا۔ اور اس کی اس زندگی کا فنکار ایک معصوم چڑیا ہو گئی۔

عورت کا پاکیزہ زیور لٹ گیا۔ زکیہ کی زندگی سیلاب رواں کی بے پروا چڑھ گئی۔ اس کے ضمیر سے گھٹی گھٹی آواز آ رہی تھی۔ وہ بہت جلد فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ "زندگی یا موت۔" زہر اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اب یہ شیشی منہ سے ایک فٹ کے فاصلے پر تھی۔ "زندگی یا موت" وہ سوچ رہی تھی اُس کا ہاتھ مضبوطی سے بھینچے ہوئے تھے۔ اچانک رحمان کا بھیانک چہرہ کمرے میں نمودار ہوا۔ اور ایک ہی جست میں شیشی زکیہ کے ہاتھ سے رحمان کے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ وہ چیخ اٹھی۔ "کنوارے جسموں کے پھاڑنے والے قصائی ہم کو بھیڑ بکریوں کی طرح چاندی کے کھنکتے ہوئے سکوں کے لئے اغوا کرتے ہو۔ تو نے چار دیواری میں بیٹھنے والی اپنی بہو بیٹیوں کو بھی نہ چھوڑا ایک غریب لڑکی کی عصمت کو لٹا دیا۔ اس کی زندگی تباہ و برباد کر ڈالی۔"

رحمان کو محسوس ہوا۔ یہ دوزخ سے نکلتے ہوئے شعلے ہیں جو اس کی رگ رگ میں پیوست ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر زور سے چیخ پڑا خاموش "خاموش" میرے دوست نے میرے اعتماد کو لوٹا ہے۔ مجھے جوش دلوایا۔ اپنی بہنوں کا دلال کہلایا۔ میں اُس سے انتقام لوں گا۔

زکیہ خوف ۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر کانپنے لگی
انور نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔
"یار ہو تو تم جیسا ہو۔ واقعی آسمان سے تارے توڑ کر
لائے ہم قائل ہو گئے تمہاری دوستی کے۔"
"دوستی" رحمان نے بھیانک قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔۔۔
"ہاہاہا۔۔۔ تو میرا دوست میرے اعتماد کو لوٹنے والے۔۔۔۔
ہاہاہا۔۔۔ ہاہاہاہا اور اس کا ہاتھ جیب میں آہستہ آہستہ رینگ
رہا تھا۔ دفعتاً ایک لمبا چمکدار چاقو باہر نکلا اور وہ آہستہ آہستہ
یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔
"یہ سچ ہے کہ میں عورتوں کے جسم کا بیوپار کرتا ہوں
لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں نے کنواری کے جسم کو اپنی
بہن سمجھا ہے۔ جو چہار دیواری میں رہتی ہے۔ میں ان کا
محافظ ہوں۔"
اس اچانک تبدیلی اور موت کو دیکھ کر انور کے اوسان
خطا ہو گئے۔ اس نے پاؤں پر پڑتے ہوئے
"نہیں۔۔۔ تم۔۔۔ میرے۔۔۔ یار ایسا نہیں کر سکتے ہو"
"بزدل اس انسان سے سبق لے۔ جس نے ذلیل زندگی
پر موت کو ترجیح دی۔ تو موت سے کانپ رہا ہے۔"
یہ کہتے ہی پانچ انچ لمبا چاقو انور کے سینے کے پار ہو گیا

انور کے سینے سے خون کی ایک پھوار کے ساتھ ہی دل ہلا دینے والی چیخ کمرے میں گونجی چند بار انور کی ایڑیاں فرش سے رگڑا ئیں اور اس کی روح زندگی کے بندھنوں سے آزاد ہو گئی۔

رحمان نے مردہ لاش کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"میرے دوست تم اکیلے ہی یہ سفر طے نہ کرو گے۔ ہم زندگی میں ہمیشہ ایک ساتھ رہے ہیں۔ اور موت بھی ایک ہی ساتھ ہونی چاہیئے۔ اس سفر پر ہم ایک ساتھ چلیں گے۔"

پھر اس نے وہی چاقو اپنے سینے میں گھونپ لیا۔

زکیہ اس بدلتے ہوئے روپ پر لرز اٹھی۔ کیونکہ رحمان نے ایمان اور دوستی کے نئے باب کی بنیاد ڈالی۔

خالی پڑا ہے ساتگین

اب تو اس کے پاس نواب خاندان کی چار نشانیاں رہ گئیں تھیں۔ ایک نوابی ٹوپی۔ دوسری شیروانی تیسرا چوڑی دار پاجامہ اور ایک تواریخی ساتگین۔

اس تواریخی ساتگین کو ایک فرسودہ میز پر رکھا گیا تھا۔ کیونکہ اب غربت نے اس نوابی خاندان پر اپنا سایہ ڈالا تھا۔ جب بھی اسکی نظر اس ساتگین پر پڑتی نواب کو ایک حسین کہانی یاد آجاتی۔ ماضی کے دھندلے دھندلے نقوش اس کے سامنے آتے تھے۔

ساتگین اس کو وہ زمانہ یاد دلاتا جب وہ حیدر آباد کے رئیس مانے جاتے تھے۔ ان کے پاس ایک شاندار حویلی تھی۔ جو رات کے وقت چاندنی کی طرح تمام حیدر آباد پر چھا جاتی تھی۔ نوکروں اور لونڈیوں کی تعداد ہی نہیں تھی۔ شراب پانی کی طرح اڑائی جاتی تھی۔ عورت پھولوں کے گجرے کی طرح گلے کی غلام اور دونوں کا بے دریغ استعمال کیا جاتا تھا۔ در اصل اس قدیمی نواب خاندان کو یہ ساتگین اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملا تھا

خیال کیا جاتا تھا کہ اس ساتگین میں قدیم نواب خاندان کے ہر فرد نے شراب کا پہلا جام پی لیا تھا۔ لیکن اب یہ ساتگین خالی پڑا تھا۔ برسوں سے کسی نازک ساقیا نے چھوا کبھی نہ تھا۔ کیونکہ اس کا گھر دولت سے خالی تھا۔

لیکن جب آخری بار اس ساتگین کو استعمال کیا گیا۔ اس وقت ایک حادثہ ہوا تھا۔ ہاں ایک بھیانک حادثہ! اس حادثے نے اب ایک افسانے کی شکل اختیار کر لی تھی

وہ ان دنوں چھوٹا تھا۔ لیکن وہ اس واقعہ کو آج تک فراموش کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ ان دنوں اس کے نوکر باندھیاں اس کو چھوٹے نواب، چھوٹے سرکار کے لقب سے یاد کرتیں۔ جب فرش مخمل پر چلنے سے اس کے پیر چھل جاتے تھے۔ لیکن اب تو اس کے پاس غربت بھرا گھر تھا۔ بڑا نواب اس کا والد تھا۔ لیکن اس کا والد شراب میں ہر وقت بدمست رہتا تھا۔ اور شراب کے نشے میں چور وہ کسی وقت اپنے حواس بھی کھو دیتا۔ تب نہ جانے کیا اناپ شناپ بکتا رہتا تھا۔

لیکن اس کی والدہ شرافت کا حسین پیکر تھی۔ وہ ایک

نیک بخت عورت تھی غریب پرور اور نیک دل تھی۔ ایک دن اُس کا پرانا نوکر غفار اس کے پاس آیا۔ اُس نے کہا۔

"بیگم صاحبہ ایک عرض ہے۔"

"ہاں ہاں" کہو غفار"

غفار کے ساتھ ایک سولہ سترہ سال کی نازک اندام لڑکی تھی۔ بیگم نے طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ کون ہے؟"

"بیگم صاحبہ یتیم لڑکی ہے۔" غفار نے کہا۔ "اس کا آخری سہارا اس کی ماں تھی۔ اب وہ اس دنیا سے سدھار گئی اس لئے میں اس کو آپکے حضور میں لایا ہوں۔ اس کو اپنے سائے میں رکھئے۔ بیگم صاحبہ شریف لڑکی ہے۔ عمر بھر آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔"

بیگم نے لڑکی کی بھولی بھالی صورت سے متاثر ہو کر کہا۔

"اچھا آج سے تم یہاں رہنا۔ اری او سلیمہ، نجمہ، کنیز، فاطمہ، نرگس۔ اِدھر آؤ" لونڈیاں حاضر ہوئیں تو بیگم صاحبہ نے کہا۔

"نجمہ آج سے یہ لڑکی تمہارے ساتھ رہے گی۔ کیا نام ہے۔ بیٹی تیرا؟" لڑکی نے انگلی دانت میں دبا کر شرمیلے انداز

میں آہستہ سے کہا۔

"نگینہ"

"اچھا نگینہ جاؤ ان کے ساتھ"

نگینہ ملنسار لڑکی تھی۔ بہت جلد ان سب میں گھل مل گئی۔ بیگم اسپر بہت مہربان تھی وہ ان کی خاص لونڈی بن گئی۔

ایک دن بیگم نے اس کے ہاتھ میں شراب سے بھرا ساتگین دیتے ہوئے کہا۔

"لو.... سنبھال کر یہ ساتگین نواب صاحب کو پیش کر دو۔"

"بہت اچھا بیگم صاحبہ"

"اور ہاں..... آداب محفل کا خیال رہے"

"جی بہت اچھا"

نواب صاحب شراب کے نشے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے تھے۔ نگینہ کے نازک ہاتھوں نے جب اس کے سامنے ساتگین رکھا۔ نشہ ہرن ہوا۔ ایک پیکر جمال کو اپنے سامنے دیکھا نواب کی آنکھوں کو اس نے خیرہ کر دیا۔ وہ منہ پھاڑ کر چیخ پڑا۔

"یہ حسن آج تک ہم سے چھپا رہا۔ محل میں رہ کر ہم محل کے گرد و نواح سے غافل رہا۔ نازنین تم کہاں چھپی تھی"

"جی ۔۔۔۔۔ وہ ۔۔۔۔ حضور بندی کا نام نگینہ ہے"۔

"نگینہ ۔۔۔ آ ۔۔۔ ہاں تم نگینہ ہو۔ انمول نگینہ ۔۔۔ جس کا نگینہ ہو ۔۔۔ سچ سچ بالکل ہو۔ ہو تراشا ہوا نگینہ"۔

نواب کی للچائی ہوئی نگاہوں نے اس کو اشارہ کیا۔ لیکن نگینہ کے حال پر خدا نے رحم کیا۔ کیونکہ بیگم صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ اور نگینہ وہاں سے بھاگ کر اپنے بستر پر سسک سسک کر رونے لگی۔ وہ اس حویلی کے گھناؤنے ماحول سے فرار چاہتی تھی۔ لیکن اس کو اور کوئی سہارا بھی پناہ کے لئے نظر نہ آرہا تھا۔ اس لئے اسی حویلی میں دم گھوٹے پڑی رہی

نواب صاحب کے دل کا قرار اس حسن بے پناہ نے لوٹ لیا۔ اب وہ اس نازک کلی کا رس چوسنے کے لئے راتوں کی نیند حرام کر چکا تھا۔ ہر کلی کو مسلنا اس کی فطرت بن گئی تھی۔

ایک دن اس کو زریں موقعہ مل گیا۔ جس کی تلاش میں وہ ایک ماہ سے تھا۔ نگینہ اس آتے ہوئے ہوا کے طوفان میں ٹھہر نہ سکی۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اپنی عصمت وحشی نواب کے مضبوط شکنجے سے بچالے لیکن وہ ستم رسیدہ چڑیا مضبوط پنجوں میں چیں چیں بھی نہ کر سکی اسکے سینے پر بھاری سل تھی۔ اور منہ پر شراب کے بھبکے نکلتا ہوا اسنیہ اس کا تمام زیور ختم ہو گیا اسکا گلعصمت لٹ چکی تھی۔ اس کے دل

میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔

انتقام کے اس جذبے نے اس کی نیند حرام کر دی۔ یہ انتقام کا جذبہ اس کی رگ رگ میں رچ گیا۔ نواب کا دیا ہوا زہر اس پر سرایت کر رہا تھا۔ آخر ایک دن اس نے اپنے مقصد کو عملی جامہ پہنانے کا موقعہ تلاش کر لیا۔ اس نے ساتگین پر قبضہ کر لیا۔ جب دوسری بار نگینہ نے نازک ہاتھوں سے ساتگین اٹھا کر خراماں خراماں ہنستی بل کھاتی نواب کے سامنے آئی آج وہ ساقی تھی۔ نواب نے سر اٹھا کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"اے ساقی میری آنکھیں خواب دیکھ رہی ہیں۔ حسینہ آج مہربان نظر آ رہی ہو۔"

نگینہ نے دلبرانہ انگڑائی لیتے ہوئے جام بڑھا کر کہا۔

"بندی پر آپ جو مہربان ہیں۔"

"اوہ ... ہاہاہا ... حسن نے ایک نئی کہانی کا آغاز کیا۔"

"جی نہیں کہانی کا اختتام ہو رہا ہے۔"

نواب ہنس پڑا۔ نگینہ کے ہی ہاتھ سے پرانے انداز سے شراب کا پہلا جام پی گیا ... "آہ کیا لطف ہے .... ساقیا ... تیرے پیمانے میں ... ... اف ... میرا کلیجہ" ... وہ دھڑام سے بستر پر گر گیا۔ ... وہی کمرہ ....

صرف وہ نا
کمرہ وہی ... فرش وہی۔ لبستر سب کچھ وہی "فرق" اس وقت نگینہ لیٹی تھی۔ آج اس نے زہر سے نواب کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔
پھر نواب اس مستی کے عالم سے واپس نہ آئے۔

کہانی ختم ہوئی۔ لیکن یہ کہانی ہر بار چھوٹے نواب کے دماغ پر ہتھوڑے مارتی اور ہر بار یہ سانگین اس کے باپ کو اس کی نظروں میں ذلیل بنا دیتا تھا۔ اب وہ اس سانگین سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ ماضی کی تلخ یادیں جو اس سانگین کے ساتھ دفن ہو جائیں۔ اس نے اس تواریخی سانگین کو ہاتھ میں اٹھایا اور آنگن میں جاکر اس کے لئے قبر کھودنے لگا۔ تاکہ وہ اس سانگین کے ساتھ ساتھ ماضی کی تمام یادوں کو دفن کر دے۔ لیکن قدرت کو اس انسان کا یہ فیصلہ ہرگز منظور نہ تھا کیونکہ اچانک زلزلہ آیا۔ جس کی وجہ سے بہت سے مکان گر گئے اور چھوٹے نواب اپنے ہی گرتے ہوئے مکان میں دفن ہو گئے۔

چھوٹے نواب نے زندگی سے نجات حاصل کی اور ان یادوں سے نجات حاصل کی جو اس کے دماغ کے سکون کو منتشر کرتی تھیں۔

دوسرے دن مردہ نواب کی لاش کو ملبہ سے نکال لیا گیا لیکن سانگین بالکل صحیح حالت میں برآمد کیا گیا۔
زلزلے کے طوفان میں چھوٹے نواب کا سارا اثاثہ

ختم ہو چکا تھا۔ اب اس کے وارثوں کے پاس صرف یہی ایک سنگین تھا۔ اس کے چھوٹے لڑکے نے اس نوار بخی سنگین کو کرنل حیدر کو ایک ہزار روپے میں فروخت کر دیا۔

جب دوسری جنگ عظیم چھڑی اس وقت کرنل حیدر برما کے محاذ پر لڑ رہا تھا۔ یہاں اس نے لوٹ مار سے بے پناہ دولت کمائی۔ جنگ ختم ہوتے ہی کرنل نے فوجی نوکری کو خیرباد کہا۔ اور لوٹ مار سے کمائی ہوئی دولت کو لے کر تجارت کے میدان میں اترا یہاں پر اس نے اپنے اثر ورسوخ سے بے اندازہ دولت کمائی اور تھوڑے ہی عرصے میں شہر کی نام دار ہستیوں میں اس کا نام لیا جانے لگا۔

لیکن بیچارے کو اپنی باوفا شریک حیات سے ہاتھ دھونا پڑے۔ پچاس سال کی اس عمر میں شریک حیات نے منہ موڑ لیا۔ بیچارے نے سوچا تھا اس عمر میں اس کو راحت نصیب ہوگی۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلی جائے گی۔

لیکن پھر اس کی امیری نے اس صدمہ کو بیس سال کی جسبنہ میں تبدیل کر دیا۔ اب کرنل حیدر اپنے آپ کو دنیا کا خوش ترین آدمی سمجھنے لگا۔ اور تھوڑے ہی دنوں

سے لبعد جدید تہذیب یافتہ سماج کی بیس سالہ دوشیزہ کے ساتھ اس کی شادی ہوئی دولت کے بل بوتے پر انہوں نے چھوٹی نواب کی بیٹی کو سنہری پنجرے میں قید کر لیا۔ اور تہذیب یافتہ سماج میں نام حاصل کیا۔۔

یہ حسینہ تہذیب یافتہ سماج کی ایک خاص رکن تھی جدید تہذیب یافتہ سماج کے نوجوانوں کے ساتھ اس کا ایک گہرے قسم کا ناطہ تھا۔ اور ہوتا بھی کیوں نہیں وہ ایک تہذیب یافتہ سماج میں پروان چڑھی نازنین تھی۔ بی۔اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ حسن بے باک کا چلتا پھرتا نمونہ تھی۔

ایسے ہی تہذیب یافتہ سماج میں جس کے جتنے بے باکانہ مراسم اونچے طبقے سے ہوتے ہیں۔ اتنا ہی اعلیٰ و افضل تہذیب یافتہ، شریف، باعزت، اور قابل کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ سرخ شراب کو شربت سمجھا جاتا ہے۔ دماغ کو فرحت اور روح کو تازگی بخشنے والا۔ دل میں جوش پیدا کرنے والا، عریانیت کو بے نقاب، وحشی، گنوار، جاہل کو تہذیب دینے والا۔ غرض تمام دنیا کی صحت اور تعریفوں سے بھرپور ایک نسخہ ہے۔ ایسے سماج میں اگر کوئی حسینہ دو چار گھونٹ شراب کے پی کر

مستی میں اپنے کسی نوجوان دوست کو گلے لگا کر اپنا شباب
لٹا دے تو گلہ کیوں؟

کرنل حیدر کے پرانے دوست کرنل شہاب نے
کہا۔

"ارے بھائی کرنل اپنی بیوی کی رسی تنگ کرو۔
تم اس قدر غافل کیوں ہو۔ وہ راستے سے بھٹک رہی
ہے۔"

"اوہ یار۔ تم بھی انہیں جاہلوں کی سی باتیں کرنے لگے
جو باہر پھرتی ہوئی تہذیب یافتہ عورتوں کے ننگے طرز
کے لباس کو دیکھ کر جل جاتے ہیں۔ ان کو کلبوں میں
جاتے دیکھ کر کہہ اٹھتے ہیں۔ یہ خراب عورتیں ہیں۔ بُری
ہیں۔ خاوند کی فرمانبردار نہیں ہو سکتیں۔ وہ یہ سب
کچھ اس لئے کہتے ہیں۔ کہ وہ خود روپیہ خرچ نہیں کر سکتے
وہی تہمت آپ بھی لگانا چاہتے ہیں۔ آپ اچھی طرح
جانتے ہیں میری بیوی پاکدامن اور شریف ہے۔ بس
نئی تہذیب کی دلدادہ ہے۔"

"جی ہاں بیشک آپ بجا فرماتے ہیں۔"

شہباز نے سوچ لیا کہ بڑھاپے کی وجہ سے کرنل کی
آنکھوں پر پردہ پڑا ہے اور اس کی بیوی نے

تہذیب یافتہ سماج کی آڑ میں ایسے ایسے کارنامے انجام
دیئے جو زبان دہرانے سے قاصر ہے۔

کرنل حیدر ایک دن ہوٹل لارین سے نکل رہا
تھا۔ اُس نے جو کچھ دیکھا حیرت سے تکتا رہا۔ غیرت
کی وجہ سے زمین میں گڑھنے لگا۔ اپنی بیوی کو کسی
نوجوان کے ساتھ لہو سے بازی میں مصروف پایا۔ اس
کے تن بدن میں آگ لگ گئی زندگی میں پہلی بار اُس
کا سر شرم سے جھک گیا۔ فوج کے ہر محاذ پر اُس
نے دشمن کو شکستیں دی تھیں۔ لیکن اس تہذیبی محاذ
پر اُس کو اتنی زبردست شکست ہوئی کہ دماغ مرتا
ہوا محسوس ہوا۔

کرنل کے بہت سے دوستوں نے یہ کبھی کہا
تھا۔ کہ اُس کی تہذیب یافتہ بیوی شراب کبھی نوش
کرتی ہے۔ لیکن کرنل سمجھتے تھے کہ شاید ان کو میری بیوی کی
کی ہمت چال پسند نہیں ہے۔

کرنل اپنے بیڈروم میں اپنے حالات پر ماتم کر
رہا تھا۔ اُس کی بیوی سے لئے شراب کے دو چار گھونٹ پی
لیے تھے اور اپنی چال میں مست تھی۔ کرنل صاحب
نے کہا۔

"آج پھر دیر......"

"آں.......کیا...."

"کہاں تھی؟"

اُس نے نشیلی آواز میں جواب دیا۔

"ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی..... کچھ ہماری خبر نہیں آتی!"

"شاعری" کرنل نے زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"خوب بہت خوب! لیکن میرے سوال کا جواب نہ ملا۔ خیر آج تو نشہ کچھ زیادہ ہی ہے!"

"نشہ" اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہاں نشہ ہو گیا۔ سرور کا یہ عالم....."

"لیکن جانِ من یہ نشہ جو جوانی بگاڑے!"

"دو چار قطرے شراب مجھ سے جو اس کیا چھین لیں گے۔ میری پیاس سمندر بھی نہیں بجھا سکتا ہے!"

"ٹھیک ہے۔" کرنل حیدر نے کہا۔ "لیکن شراب اگر یہیں نوش کی جائے تو بہتر ہے۔ گھر سے بہتر میخانہ کہاں ہے۔"

"آ.......ہاں" بیوی نے کہا۔ "بہتر ہے لیکن ڈر

تھا۔ کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔ ورنہ یہ خواہش بہت پہلے اُبھری تھی۔"

"اچھا" کرنل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب کل کا انتظار ہے۔ کل کا دن رنگین ہوگا۔ کل ہی ہماری نارنجی مئے نوشی شروع ہوگی۔۔۔۔ ہاں کل!"

دوسرے دن کرنل حیدر نے اپنی الماری سے نارنجی ساتگین نکال لیا۔ اور پھر اپنی بیوی سے کہنے لگا۔ "ہمارا پہلا شراب کا دور آج سے شروع ہو رہا ہے اس لئے یہ پہلا مئے نوشی کا دور نارنجی ساتگین سے شروع کیا جائے گا۔"

"آج آپ میرے اُوپر بہت مہربان ہیں۔ کیا بات ہے۔" اُس کی بیوی نے اُس سے دریافت کیا۔ کرنل نے کہا۔

"تہذیب کا مقصد آج سمجھ میں آیا۔ تم بہت بلند تہذیب یافتہ ہو۔ آج قدرت مجھ پر مہربانی کر رہی ہے۔ جو یہ نادر موقعہ نصیب ہوا۔"

کرنل نے تھوڑی شراب ساتگین سے انڈیلی اور اپنی بیوی کو پیش کی۔ کرنل نے پیگ پیش کرتے ہوئے کہا

"چیرز۔۔۔۔ ہماری محبت کے لئے۔"

جام سے جام ٹکرائے کرنل کی بیوی نے شراب کی ہلکی ہلکی چسکیاں لیتی شروع کیں۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اُس پر غشی طاری ہوئی اور غنودگی کے عالم میں کو موت نے گلے لگا لیا۔

ختم شُد

وحشی سعید ساحل کی شاہکار تخلیق ماہ اکتوبر ۱۹۶۸ء

میں شائع ہو رہی ہے

یہ بستی یہ لوگ

یہ المیہ داستان آپ کی اپنی داستان ہے۔
ساڑھے تین سو صفحات پر پھیلی ہوئی اس ناول کی قیمت صرف ساڑھے چار روپے معہ ڈاک خرچ ہے۔ آج ہی خواہشمند جلدی سے جلدی اس کتاب کا آرڈر بک کرا لیجئے۔

ملنے کا پتہ:۔ پوش کرن نگر۔ سرینگر کشمیر